188664

TEXT CUT BOOK
ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188669
LIBRARY
UNIVERSAL

Osmania University Library

Call No. ۸۹۱٫۴۳۳۹ Accession No. ۱۷۵۶۳ 17563

ک - پ

Author کرشن چندر

Title پرانے خدا ۱۹۴۴ء

پُرانے خدا

کرشن چندر

عبد الحق اکیڈمی

اشاعت منزل اُردو گلی حیدرآباد (دکن)

فہرست مضامین

نمبر سلسلہ	مضمون	صفحہ
(۱)	مقدمہ	۵
(۲)	پرانے خدا	۱۷
(۳)	چڑیا کا غلام	۳۹
(۴)	مثبت اور منفی	۴۹
(۵)	جیل سے پہلے، جیل کے بع	۶۱
(۶)	حادثے	۷۳

صفحہ	مضمون	نمبر سلسلہ
۹۳	غلاظت	(۷)
۱۱	مقدس	(۸)
۲۳	پہلی اُڑان	(۹)
۵۳	ایک شورئیلی تصویر	(۱۰)
۰۵	آتا ہے یاد مجھ کو	(۱۱)

مقدمہ

گذشتہ چند سال کے عرصے میں اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ نیا دور ہمیشہ ایک طرح کے ذہنی انقلاب کے ساتھ آتا ہے۔ نئے دور میں اقدار بدل جاتی ہیں۔ نئی اقدار کے بل بوتے پر نئے ادیب پرانی شاہراہ سے منھ موڑتے ہیں، اور اپنے لئے ایک نیا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

اس نئے ادب میں کوئی نام اس قدر عزت اور توصیف کا مستحق نہیں جتنا کرشن چندر صاحب کا نام ہے۔ اسکی کئی وجوہات ہیں۔ نئے ادیبوں میں سے اور کسی کی فکر میں اتنا ٹھہراؤ، اتنا سلجھاؤ نہیں جتنا انکی فکر میں ہے۔ نئے ادب کے محرکات سے

ان کی ہمدردی بے لوث ہے۔ اُن میں اندھا جوش یا انتہا پسندی نہیں۔ اور اگر خیالات میں وہ نئے ادیبوں کے رہنما ہیں تو فن کی حد تک بھی نئے لکھنے والوں میں کوئی اُن تک نہیں پہنچ سکتا، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ انکے فن کا ابتدائی دور ہے۔ اگر وہ اسی طرف لگے رہے اور ان کا انہماکِ فن اور خلوص فکر اسی طرح پروان چڑھتا گیا تو ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ان کا نام منشی پریم چند کے نام سے بھی زیادہ احترام کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

یہ مجموعہ ان کے چند تازہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلا افسانہ "پرانے خدا" ہے۔ اس کا موضوع نئے افسانوی ادب کے ساتھ ہی ساتھ اردو میں آیا۔ "انگارے" میں بھی یہ موضوع بار بار دُھرایا گیا تھا۔ لیکن کرشن چندر کے اس افسانے میں کہیں گالیاں نہیں۔ پُرانے خداؤں سے نہیں بلکہ پُرانے "خدا پرستوں" سے افسانہ نگار کو حقیقی دلچسپی ہے۔ لطیف اور پُرخلوص طنز یہاں وہ کام کر جاتا ہے جو راست اعتراض سے نہیں ہو سکتا۔ منظر نگاری کی حد تک یہ افسانہ ایک شاہکار ہے۔ متھرا کے ہر قسم کے پجاری وہاں کے رہنے والے، اور وہاں آنے والے سب زندہ تصویریں کی

طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ تصویریں ہیں اور ان کی معاشی تاویلیں ہیں، مگر اس خوبی سے کہ وہ تصویروں کا رنگ معلوم ہوتی ہیں۔ آخر میں کرشن اور رادھا کا قصّہ ہے۔ ہندوستان کی عورت کا خلوص اور انتظار اور اس کا پھل۔ ایک ہلکی سی رومانیت ہے جو معاشی معانی پر شکر کی طرح چڑھی ہوئی ہے۔

"چڑیا کا غلام" انوکھے قسم کا افسانہ ہے۔ طنز اور تضحیک پر اسکی بنیاد ہے۔ اس کا طرز صنعت مغربی موسیقی کی اس صنف سے ملتا جلتا ہے جس کو اصطلاح میں (Caprice) کہتے ہیں۔ موسیقی سے یہ صنف اس صدی میں ادب اور سینما میں منتقل ہوئی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کی شاعری میں اس کے نمونے ہیں۔ مغرب کے افسانیاتی ادب نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ افسانہ انہیں اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس افسانے کا کردار خاص "چڑیا کا غلام" اور دوسرے کردار اس طرح حرکت کرتے ہیں جیسے کسی روسی (Ballet) کے افراد۔ لیکن نفسیات کا دامن مصنف کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا اور سڑک کی عالمگیر لڑائی کے میدان میں جب ہیرو پھر نمایاں ہوتا ہے،

تو نفسیاتی بنیاد پر۔

"مثبت اور منفی" بھی جدید مغربی افسانیاتی تحریکات سے متاثر ہے۔ اسکے انداز تحریر پر جیمز جائس اور اس تحریک کا اثر ہے جو (تحریک ماورائے Surrealism) (حقیقت نگاری) کے نام سے چند سال تک یورپ میں مقبول رہی۔ اردو میں یہ ایک انوکھی چیز ہے۔ کرشن چندر کا یہ فسانہ (یا مضمون) محض تقلید نہیں۔ انکی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ مطلب شروع سے آخر تک واضح ہے۔ مطلب کی وضاحت کا باعث سلجھی ہوئی تصوریت (Symbolism) ہے۔

"جھیل سے پہلے جھیل کے بعد" بہت دلچسپ ہے۔ انسان ہزارہا سال پہلے اور غالباً انسان کے ارتقاء کے ہزارہا سال بعد تک کشمیر کی طویل وادی ایک خوبصورت جھیل تھی اس کا ذکر قدیم ترین سنسکرت کتابوں میں بھی ہے اور جدید جغرافیائی تحقیقات میں بھی۔ معلوم نہیں کسی انسان نے اس خوبصورت جھیل کو کبھی دیکھا بھی یا نہیں۔ اب اسکی یادگار کی طور پر ڈلر، ڈل، مانس بل اور انچر کی جھیلیں باقی رہ گئی ہیں اور یہ جھیلیں

بھی آہستہ آہستہ دلدل بنتی جارہی ہیں۔ جب پانی نے رامپور کے قریب اپنے سنگین حصار کو توڑ دیا تو جہلم کو پنجاب پہنچنے کا راستہ مِل گیا۔ اور اپنے ساتھ وہ کشمیر کی جھیل کو بہا لے گئی جہاں جھیل تھی وہاں دنیا کی خوبصورت ترین وادی وجود میں آئی۔ وہ وادی جس کے حُسن اور جس کی غربت کی تصویر شاید کرشن چندر سے بہتر کسی اور نے اردو نثر میں نہیں کھینچی۔ اِس وادی میں انسان نے قدم رکھا گھر بنائے۔ رہنے لگا۔ اپنے ساتھ وہ تمدن لایا۔ اور انسان آئے۔ جاگیردارانہ نظام آیا۔ سرمایہ دارانہ دور حکومت آیا۔ اور وہ وادی جو جھیل سے جنت بنی تھی، انسانوں کے لئے جہنم بن گئی۔

"حادثے" ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ اور انسان کی نفسانی خود غرضی کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ دو طرح کی محبتوں کی کشمکش کی کہانی ہے۔ ایک جو زیادہ طوفانی ہے۔ وقتی طور پر کامل فتح پاتی ہے۔ دوسری دل کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی ہے۔ اور چونکہ آزمائش کے وقت وہ ہار چکی ہے اسلئے پچھتاوا بن کے عمر بھر کے لئے زندگی تلخ کر دیتی ہے۔

"غلاظت" ایک دلچسپ سفر کی داستان ہے، اور اس سفر میں گرد میں اَٹے ہوئے انسانی کردار اپنے آپ کی اور اپنے ماحول اور تربیت کی غلاظت ہر منزل پر نمایاں کرتے جاتے ہیں۔

"مقدس" بڑا دلچسپ افسانہ ہے اسکی بنیاد ایک بڑی گہری نفسیاتی حقیقت پر ہے۔ اور اسکی تعمیر طنز اور شوخی سے ہوئی ہے ایک عام شخصیت کا نفسی ہیجان جو معاشیات اور محبت کے اعلیٰ مثالی تصور کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے اس افسانے کا موضوع ہے۔ اس افسانے کا پس منظر ہندوستان کے ایک بڑے شہر کی چھوٹی چمک والی، مغرب زدہ، چکا چکا بوم چک کرتی ہوئی زندگی ہے۔ اس پس منظر کی ترغیب آہستہ آہستہ ہیرو کے نفسی ہیجان کو ابھارتی ہے جو پہلے ہی معاشی مجبوریوں کا زخم خوردہ ہے، اور بالآخر جنسی خمارین کے اچانک اسے دبوچ لیتی ہے۔ افسانے کا انجام نفسیاتی باریک بینی کا شاہکار ہے۔ اس میں نفسیاتِ تحلیلی اور معاشی توجیہہ مل کر ایک ہوجاتے ہیں۔

"پہلی اڑان" کشمیر کے پس منظر میں ایک "اِصلاحی"

افسانے کی نہج پر شروع ہوتا ہے۔ اور ہیرو کی پہلی اڑان کے ساتھ ایک معاشی اور "رومانی" انجام پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے وہ اس افسانے کے "عام" موضوع میں ہے۔ یعنی غربت اور اس لالچ کی وجہ سے جو غربت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غریب لڑکیاں اپنی آبرو بیچتی ہیں۔ لیکن یہ موضوع کشمیر کی غریب رعایا کی عورتوں پر اس تفصیل اور تکرار سے صادق نہیں آتا۔ کشمیری عورتوں میں اور خصوصاً غریب ترین طبقے میں عفت اور عصمت کا احساس انتہا درجہ کا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غربت اور بھوک کے آگے عزت اور آبرو کا سوال باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس قسم کے واقعات استثناء کی صورت رکھتے ہیں۔ نہ کہ کلیہ کی۔ کنہیا لال کپور نے اپنے مضمون "رومان کی تلاش" میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں اس موضوع کی "عام" منطقی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے افسانوں کی محرک ایک طرح کی پر جوش رومانیت ہوتی ہے جو دستِ چپ کے ہندوستانی افسانہ نگاروں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔

یہی پرجوش رومانیت کرشن چندر کے اسلوبِ تحریر میں روحِ رواں کا کام انجام دیتی ہے۔ اسکی ٹھیس سے الفاظ اور خیالات یک جہت اور یک عنصر ہو کے چشموں کی طرح اُبل پڑتے ہیں مثلاً پہلے ہی افسانے میں :-

"اجنبی ناامید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دور

——— ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے"

وہ اس جھونپڑے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا لیکن اُسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں' رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے۔ چہرے پر لاتعداد جھرّیاں ....

کرشن جی نے گلوگیر آواز میں کہا" رادھا میں آ گیا ہوں"
لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی' دیئے کی لَو کی طرف تکتی ہوئی۔ رادھا میں آ گیا ہوں۔ کرشن جی نے چلّا کر کہا۔

لیکن رادھا نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ اپنے محبوب کی راہ
تکتے تکتے اس کی آنکھیں اندھی ہو چکیں تھیں اور
کان بہرے۔

.......زندگی سے پرے، موت سے پرے،
انصاف سے پرے.....“

جہاں تک طرز تحریر کا تعلق ہے۔ اردو کا کوئی اور افسانہ نگار کرشن چندر کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ درد ہو یا طنز، رومانیت ہو یا حقیقت نگاری، ان کا قلم ہر موقع پر ایسی دلکش چال چلتا ہے جو بانکی بھی ہوتی ہے اور انوکھی بھی، لیکن جو اس قدر سادہ اور فطری ہوتی ہے۔ جیسے صبح کے وقت چڑیوں کی پرواز، تصنع کا بعید ترین شائبہ بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔ جو نفس مضمون ہوتا ہے، اسکی اندرونی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کے ان کا قلم حرکت کرتا ہے۔

لیکن جو چیز کرشن چندر کو اور تمام ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اپنے نفس مضمون کے بیان اور خیالات کے اظہار میں ان کی بے تعصبی ہے۔ ان میں جوش و خروش ہے،

لیکن تعصب نہیں۔ اُن میں ایک ایسی ذاتی ہمدردی ہے جو کسی طرح کی منافرت کے لئے گنجایش باقی نہیں چھوڑتی۔ یہی سچی انسانی ہمدردی اشتراکیت کا سب سے بڑا جوہر ہے یہ جوہر کرشن چندر کو عقیدتاً بھی ملا ہے اور طبعاً بھی اس ہمدردی اور خلوص کی وجہ سے وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھہراؤ اور ضبط کے ساتھ کہتے ہیں۔ انکی چٹکیاں تکلیف دہ نہیں ہوتیں مگر اپنا کام کر جاتی ہیں۔ وہ گالیاں نہیں دیتے۔ یا تو اپنے شیریں اندازِ تحریر میں سمجھاتے ہیں یا شوخی اور طنز کے ذریعے اشاروں اشاروں میں مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں۔ وہ قدامت پسندی کی رجعتوں کے سب سے زیادہ مخالف ہیں، لیکن انکی مخالفت بغاوت کا علم نہیں بلند کرتی، وہ ایک نئی سرداری کا علم بلند کرتی ہے۔ جس سے قدیم سرداری خود بخود باطل قرار پا جاتی ہے۔ میں شروع ہی میں لکھ آیا ہوں کہ یہ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا ابتدائی دور ہے۔ اسے ان کا "رومانی دور" کہا جا سکتا ہے، میری پیشین گوئی ہے کہ وہ ایک دن اس دور سے نکل کے دوسرے دور میں قدم رکھیں گے جو عمر اور

تجربے کی وجہ سے ان کے حسنِ نیت اور حسنِ حقیقت نگاری کو دوبالا کردے گا۔ وہ دور صرف ان کے لئے ہی نہیں، اردو ادب کے لئے بھی مبارک ہوگا۔

عزیز احمد

بنجارہ ھِل
حیدرآباد دکن

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

پُرانے خدا

متھرا کے ایک طرف جمنا ہے اور تین طرف مندر، اس حدود اربعہ میں نائی، حلوائی، پانڈے، پجاری اور ہوٹل والے بستے ہیں۔ جمنا اپنا رخ بدلتی رہتی ہے۔ نئے نئے عالیشان مندر بھی تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن متھرا کا حدود اربعہ وہی رہتا ہے، اس کی آبادی کی تشکیل اور تناسب میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونے پاتی۔ سوائے ان دنوں کے جب جنم اشٹمی کا میلہ معلوم ہوتا ہے۔ کرشن جی کے بھگت اپنے بھگوان کا جنم منانے کے لئے ہندوستان کے چاروں کونوں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان دنوں کرشن جی کے بھگت متھرا پر یلغار بول دیتے ہیں اور مدراس سے، کراچی سے، رنگون سے، پشاور سے، ہر سمت سے ریل گاڑیاں آتی ہیں۔ اور متھرا کے اسٹیشن پر ہزاروں جاتری اگل دیتی ہیں، جاتری سمندر کی لہروں کی طرح بڑھے چلے آتے ہیں اور مندروں، گھاٹوں

ہوٹلوں، اور دھرم شالاؤں میں سما جاتے ہیں۔ متھرا میں کرشن بھگتوں کے استقبال کے لئے پندرہ بیس روز پہلے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مندروں میں صفائی شروع ہوتی ہے۔ فرش دھلائے جاتے ہیں۔ کلسوں پر دھات پالش چڑھایا جاتا ہے، زرکار پنگوڑے اور جھولے سجائے جاتے ہیں۔ دیواروں پر قلعی اور رنگ ہوتا ہے۔ دروازوں پر گل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ دکانیں رادھا کرشن جی کی مورتیوں سے سجائی جاتی ہیں۔ حلوائی پوری کچوری کے لئے بناسپتی گھی کے ٹین اکٹھے کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے کرائے دگنے بلکہ سہ گنے ہو جاتے ہیں۔ دھرم شالائیں چونکہ خیراتی ہوتی ہیں اس لئے ان کے منیجر ایک کمرے کے لئے صرف ایک روپیہ کرایہ وصول کرتے ہیں۔ کسان لوگ جو ان خیراتی دھرم شالاؤں میں ٹھہرنے کی توفیق نہیں رکھتے، عموماً جمنا کے کسی گھاٹ پر ہی سو رہتے ہیں۔ گھاٹ چونکہ پختہ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں اس کے لیے گھاٹ منتظم سونے والے جاتریوں سے ایک آنہ فی کس وصول کر لیتے ہیں اور اصل گھاٹ پر سونے کے لئے ایک آنے کا تاوان بہت کم ہے۔ کنارِ جمنا، سر پر کدم کی چھائیاں، جمنا کی لہروں کی میٹھی میٹھی لوریاں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، تاروں بھرا آسمان اور مندروں کے چمکتے ہوئے کلس، جب جی چاہا سو رہے، جب جی چاہا اٹھ کر جمنا میں ڈبکیاں لگانے لگے۔ ایک آنے

یں دو مزے، اس پر بھی بہت سے کسان لوگ گھاٹ کے غریب منتظموں کو ایک آنہ کرایہ بھی ادا کرنا نہیں چاہتے۔ اور گھاٹ پر سونے اور جمنا پر نہانے کے مزے مفت میں لوٹنا چاہتے ہیں۔ انسان کی فطری کمینگی ....!

جنم اشٹمی سے دو روز پہلے میں متھرا میں آ پہنچا، متھرا کے بازار، گلیاں اور مندر جاتریوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور جاتریوں کے ریوڑوں کو مختلف مندروں میں داخل کر رہے تھے۔ ان جاتریوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ متھرا میں ہندوستان بھر کی بوڑھی عورتیں جمع ہو گئی ہیں۔ بوڑھی عورتیں مالا پھیرتی ہوئیں، اور لاٹھی ٹیک کر چلتے ہوئے مرد .... کھانستی ہوئی، گٹھیا کی ماری ہوئی۔ رعشہ براندام مخلوق جو یہاں اپنے گناہ بخشوانے کی امید میں آئی تھی۔ جتنی بدصورتی یہاں میں ایک گھنٹے کے عرصے میں دیکھ لی، اتنی شاید میں اپنی ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکتا، متھرا کا یہ احسان میں قیامت تک نہیں بھول سکتا۔

متھرا پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے رہنے کے لئے جگہ تلاش کی۔ ہوٹل والوں نے بالکونیاں تک کرائے پر دے رکھی تھیں۔ اور انکی کھڑکیوں دروازوں، اور بالکونیوں پر جابجا جاتریوں کی گیلی دھوتیاں ہوا میں لہراتی دکھائی دیتی تھیں۔ دھرم شالائیں جاتریوں سے بھڑ کے چھتوں کی طرح

بھری ہوئی تھیں۔ کوئی مندر بنگالیوں کے لئے وقف تھا تو کوئی مدراسیوں کے لئے، کسی دھرم شالہ میں صرف ممبو دری براہمنوں کے لئے جگہ تھی تو کسی میں صرف کائستھ ٹھہر سکتے تھے۔ اس سرائے میں اگروالوں کو ترجیح دیجاتی تھی، تو دوسری سرائے میں صرف امرتسر کے اروڑے ٹھہر سکتے تھے۔ ایک دھرم شالہ میں ایک کمرہ خالی تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر پانڈے جی سے کہا۔ میں ہندو ہوں یہ دیکھئے ہاٹ پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔ اگر آپ انگریزی نہیں پڑھ سکتے تو چلئے بازار میں کسی سے پڑھوا لیجئے، غریب جاتری ہوں اپنی دھرم شالہ میں جگہ دے دیجئے آپ کا بڑا احسان ہوگا۔"

پانڈے جی کی آنکھیں غلافی تھیں اور بھنگ سے سُرخ، جینوا کا مقدس تاگا ننگے پیٹ پر لہرا رہا تھا۔ کمر میں رام نام کی دھوتی تھی۔ چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑے مجھے گھورتے رہے، پھر گھگھیائی ہوئی آواز میں جس میں پان کے چونے اور کتھے کے بُلبُلے سے اٹھتے معلوم ہوتے تھے، بولے "آپ کون ہو۔!"

میں نے جھلّا کر کہا۔ میں انسان ہوں، ہندو ہوں، کالا شاہ کاکو سے آیا ہوں۔"

"ناں، ناں! پانڈے جی نے اپنا بایاں ہاتھ گوتم بدھ کی طرح اوپر

اٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم پوچھت ہیں۔ آپ کون گوت ہو؟'

گوت؟ میں نے رک کر کہا۔ مجھے اپنی گوت تو یاد نہیں۔ بہرحال کوئی نہ کوئی گوت ضرور ہوگی۔ آپ مجھے فی الحال اپنی دھرم شالہ۔ اس خیراتی دھرم شالہ میں رہنے کے لئے جگہ دیدیں' میں گھر پر تار دے کر اپنی گوت منگوائے لیتا ہوں'۔

'ناں! ناں! پانڈے جی نے پان کی پیک زور سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ہم ایسو مانس کیسو راکھیں؟ نہ گوت نہ جات'!

میں متھرا کے بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ فضا میں کچوریوں کی کڑوی بو جمنا کے مہین کیچڑ کی سڑاند اور بناسپتی گھی کی گندی باس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ متھرا کی خاک جاتریوں کے قدموں میں تھی' ان کے کپڑوں میں تھی' اُن کے سر کے بالوں میں' ناک کے نتھنوں میں' حلق میں' میرا دم گھٹا جاتا تھا اور جاتری شری کرشن مہاراج کی جے کے نعرے لگا رہے تھے۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے رہنے کے لئے ابھی تک کہیں جگہ نہ ملی تھی۔ ایک پنواڑی کی دکان پر میں نے ایک خوش پوش خوشرو نوجوان کو دیکھا کہ سر تا پا براق کھدر میں ملبوس' پان کلے میں دبائے کھڑا ہے۔ آنکھوں سے اور چہرے سے ذہانت کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

مسٹر؟ میں نے اُسے نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا۔ کیا آپ مجھے جیل خانے کے سوا یہاں کوئی اور ایسی جگہ بتا سکتے ہیں جہاں ایک ایسا انسان جو ہندو ہو، پنجابی ہو، کالا شاہ کاکو سے آیا ہو، اور جسے اپنی گوت کا علم نہ ہو، میلے کے دنوں اپنا سر چھپا سکے؟

نوجوان نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا، چند لمحوں کے لئے مجھے گھورتا رہا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ آپ پنجابی ہیں نا! اسی لئے آپ یہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں...... در اصل بات یہ ہے کہ ــــ معاف کیجئے گا..... پنجابی بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ یہاں سے لڑکیاں اغوا کر لیجاتے ہیں!'

اور ان لڑکیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو اس طرح اغوا ہو جاتی ہیں، میں نے پوچھا۔

ایک دُبلا پتلا آدمی جس کا قد بالنس کی طرح لمبا تھا اور منہ چھچھوندر کا سا کھدر پوش نوجوان کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ بابو صاحب، آپ متھرا کی بات کیوں کرتے ہیں۔ متھرا تو پوتر نگری ہے۔ میں تو بمبئی تک گھوم آیا ہوں وہاں بھی پنجابیوں کو شریف محلوں میں کوئی گھسنے نہیں دیتا!'

دو چار لوگ ہمارے ارد گرد اکٹھے ہو گئے، میں نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ کیا آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟

جی ہاں، خوش رو نوجوان نے پان چباتے ہوئے جواب دیا۔

تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پنجاب سب سے آخر میں انگریزوں کی عملداری میں آیا۔ اور چھوٹی بچیوں کو جان سے مار ڈالنے کی رسم جو ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی رائج تھی۔ پنجاب میں سب سے آخر میں خلاف قانون قرار دی گئی۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے شریف لوگ اکثر اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔

"اس سے کیا ہوا؟"

ہوا یہ کہ پنجاب میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ۵ : ۱ ہو گیا۔ پانچ مرد اور ایک عورت۔ اب بتائیے باقی چار مرد کہاں جائیں، مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر عورت ایک دم چار پانچ خاوند کر سکے جیسا کہ تبت میں ہوتا ہے، کیا آپ اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔

نوجوان ہنسنے لگا۔

میں نے کہا پنجاب میں لڑکیاں کم ہیں۔ پنجابیوں نے دوسرے صوبوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا، بنگال میں لڑکیاں زیادہ ہیں۔ وہاں لوگ ایک بیوی رکھتے ہیں۔ اور ایک داشتہ جو عموماً ودھوا ہوتی ہے، سندھی اور گجراتی مرد سمندر پار تجارت کے لئے جاتے ہیں اور اکثر گھروں سے کئی

سال غائب رہتے ہیں۔ اسی لئے سندھ میں اوم منڈلیاں بنتی ہیں اور گجرات میں بکری کے دودھ اور برہمچریہ کا پرچار ہوتا ہے۔ مرض ایک ہے، نوعیت وہی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ شریف کون ہے اور بدمعاش کون؟ جو حقیقت ہے اس کا آپ سامنا کرنا نہیں چاہتے۔ الٹا پنجابیوں کو کوستے ہیں"

نوجوان بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسا، پان گلے سے موری میں جاگرا، وہ میرے بازو میں بازو ڈال کر کہنے لگا۔ آئیے صاحب میں آپ کو اپنے گھر لئے چلتا ہوں۔

تھوڑے ہی عرصے میں ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے

وہ ایک نوجوان وکیل تھا۔ ایک کامیاب وکیل، اس کا ذہین چہرہ، فراخ ماتھا اور مضبوط تھوڑی اس کے عزم راسخ کی دلیل تھے۔ وہ مدراسی برہمن تھا، متھرا میں سب سے پہلے اُس کا دادا آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے دادا کے

کسی رشتہ دار نے جو مدراس میں ایک مندر کا پجاری تھا، کسی آدمی کو قتل کر دیا۔ ٹھاکر جی کو ایک پجاری کے گناہ کے بار سے بچانے کے لئے میرے دوست کے دادا نے ایک رات کو مندر سے ٹھاکر جی کی مورتی کو اٹھا لیا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر مدراس چل دیا۔ سفر کرتے کرتے وہ متھرا آن پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس کی آتما کو سکون نصیب ہوا۔ اور اس نے ٹھاکر جی کو ایک مندر میں استھاپت کر دیا۔ آج اسی دادا کا پوتا میرے سامنے مندر کی دہلیز پر کھڑا تھا،

اور میں اس کے گٹھے ہوئے جسم اور چہرے کے تیکھے نقوش میں اُس بوڑھے برہمن کے عزم اور اعتقاد کی جھلک دیکھ رہا تھا جس کی تصویر اس کی بیٹھک میں آویزاں تھی۔

نہا دھو کر اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم میلے کی سیر کو نکلے، جو گلی بازار سے وشرام گھاٹ کی طرف جاتی ہے، اس میں سینکڑوں نائی بیٹھے استروں سے جاتریوں کے سر مونڈ رہے تھے، گول گول چمکتے ہوئے، منڈھے ہوئے سر اُن سپید چھتریوں کی طرح دکھائی دیتے تھے جو برسات کے دنوں میں خود بخود زمین پر اُگ آتی ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان سپید سپید چھتریوں پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرا جائے! اتنے میں ایک نائی نے میری آنکھوں کے سامنے ایک چمکدار استرا گھمایا اور مسکرا کر بولا بابو جی سر منڈا لو، بڑا پن ہوگا، میں نے اپنے دوست سے پوچھا یہ جاتری لوگ سر کیوں منڈاتے ہیں، کہنے لگا۔ دان پن کرنے کی خاطر، یہ لوگ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی روحوں کے لئے دان پن کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے سر منڈانا بہت ضروری ہے۔ اور یہاں ایسا کون شخص ہوگا جس کا اب تک کوئی عزیز یا رشتے دار نہ مرا ہو، میں نے جواب دیا میری چندیا پر پہلے ہی تھوڑے سے بال ہیں۔ میں انہیں حجام کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں

سمجھتا ہوں کہ ایک بال جو چندیا پر ہے اُن بالوں سے کہیں بہتر ہے جو حجام کی مٹھی میں ہوں۔ ہم لوگ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے وشرام گھاٹ پہنچ گئے۔ گھاٹ پر بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں اور لوگ ان میں بیٹھ کر جمنا جی کی سیر کے لئے جا رہے تھے ہم نے بھی ایک کشتی لی اور تین گھنٹے تک جمنا میں گھومتے رہے۔ جن کے کنارے پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے کہیں کہیں مندروں اور دھرم شالاؤں کی چوبرجیاں اور کدم کے درخت نظر آجاتے۔ ایک جگہ دریا کے کنارے ایک پرانے شکستہ محل کے بلند کنگرے نظر آئے استفسار پر میرے دوست نے بتایا کہ اسے کنس محل کہتے ہیں۔ میں نے کہا، تین چار سو سال سے زیادہ پرانا معلوم نہیں ہوتا کہنے لگا ہاں اسے کسی مرہٹہ سردار نے بنوایا تھا۔ اب زود الاعتقاد لوگوں کو خوش کرنے کے لئے یہ کہدیا جاتا ہے کہ یہ اُسی کنس کا محل ہے جس کے ظلموں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھگوان نے جنم لیا تھا۔ میں نے پوچھا کس زمانے میں ظلم نہیں ہوتے؟ وہ ہنس کر بولا اگر یہی پوچھنا تھا تو متھرا کیوں آئے .... وہ دیکھو ریل کا پُل!..

متھرا میں سب سے زیادہ خوبصورت شے شاید یہی ریل کا پل ہے مضبوط جدید بلند، ریل گاڑی نہایت پرشکوہ انداز میں جمنا کے سینے کے اُوپر دندناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ کرشن جی کے جنم دن کو جمنا فرط محبت سے

اُمڈی چلی آتی تھی۔ اور جب تک اُس نے کرشن جی کے قدم نہ چھو لئے اسکی لہروں کا طوفان ختم نہ ہوا۔ جمنا میں اب بھی طوفان آتے ہیں۔ لیکن اس کی لہروں کی ہیجانی اس ریل گاڑی کے قدموں کو بھی نہیں چھو سکتی جو اس کی چھاتی پر دندناتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ جمنا کی سربلندی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔

جب ہم واپس آئے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور وشرام گھاٹ پر آرتی اتاری جا رہی تھی۔ عورتیں رادھے شیام، رادھے شیام گاتی ہوئی جمنا میں نہا رہی تھیں۔ شنگھ اور گھڑیال زور زور سے بج رہے تھے، جاتری چڑھاوا چڑھا رہے تھے۔ اور جمنا میں پھل اور پھول پھینک رہے تھے، پانڈے دکشنا سنبھالتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ آرتی اتارتے جاتے تھے۔ ایک پانڈے نے ایک غریب کسان کو گردن سے پکڑ کر گھاٹ سے باہر نکال دیا۔ کیونکہ کسان کے پاس دکشنا کے پیسے نہ تھے۔ شاید کسان سمجھتا تھا کہ بھگوان کی آرتی پیسوں کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ وشرام گھاٹ کی نچلی سیڑھیوں تک جمنا بہتی تھی۔ لیکن یہاں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھا۔ اور اس کیچڑ میں سینکڑوں چھوٹے موٹے کچھوے کلبلا رہے تھے اور مٹھائیاں اور پھل کھا رہے تھے۔ ان کے ملائم مٹیالے جسم ان جاتریوں کی ننگی کھوپڑیوں کی طرح نظر

آتے تھے جن کے بال نائیوں نے مونڈ کر صاف کر دیئے تھے۔ رادھے کرشن، رادھے کرشن، جاتری چلا رہے تھے، نو بیاہتا جوڑے کشتیوں میں بیٹھے ہوئے مٹی کے دیئے روشن کر کے انہیں جمنا کے سینے پر بہا رہے تھے۔ جن کے سینے پر اس قسم کے سینکڑوں دیئے روشن ہو اٹھے تھے۔ اور نو بیاہتا جوڑے مسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے، ہمارے بالکل قریب ہی ایک زرد رُو نوجوان لڑکی نے مٹی کے دو دیئے روشن کئے اور انہیں جمنا کے حوالے کر دیا۔ دیر تک وہ وہاں کھڑی اپنے ہاتھ اپنے سینے سے لگائے اُن دیئوں کی طرف دیکھتی رہی اور ہم اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کی طرف دیکھتے رہے۔ اُس لڑکی کے ساتھ اس کا خاوند نہ تھا، نہ وہ بیاہتا معلوم ہوتی تھی، پھر ان جھلملاتے ہوئے دیئوں کی لَو کو کیوں اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا، یہ لرزتی ہوئی شمع محبت ..... لڑکی نے یکایک میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چلی گئی۔ میرے دوست کے لب بھینچے ہوئے تھے، رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، کیا جمنا میں اتنی طاقت نہ تھی کہ محبت کے دو کانپتے ہوئے شعلوں کو ہم آغوش ہو جانے دے۔ یہ دیواریں، یہ پانی کی دیواریں پیسے کی دیواریں، سماج، ذات پات اور گوت کی دیواریں ..... امیرا دل

غیر معمولی طور پر اُداس ہو گیا۔ اور میں نے سوچا کہ میں کل متھرا سے ضرور کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ برندابن میں یا شاید گوکل میں جہاں کی سادہ اور پاک و صاف فضا میں میرے دل کو اطمینان نصیب ہو گا۔

برندابن میں بن کم تھا اور پکی گلیاں اور کھلی سڑکیں زیادہ تھیں، برندابن کے عالیشان مندروں کی وسعت اور عظمت پر محلوں کا دھوکہ ہوتا تھا۔ راجہ مان سنگھ کا مندر، میرا کا مندر یا ہر عمارت میں کرشن جی کی مورتی موجود تھی، ہر جگہ پانڈے موجود تھے۔ لیکن ایک بات میں برندابن متھرا سے بڑھا ہوا تھا برندابن میں گائیڈ بھی موجود تھے، انگریزی بولنے والے پڑھے لکھے گائیڈ، پہلے لوگ مندروں میں بے کھٹکے چلے جایا کرتے تھے، اب بھگوان نے گائیڈ رکھ لئے تھے، خدا وہی پرانے تھے۔ لیکن جدید مذہب کے سارے لوازمات سے بہرہ ور، آخر یہ نئی تہذیب بھی تو انہیں کی بنائی ہوئی تھی۔

برندابن کے ایک مندر میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں سات آٹھ سو سادھو ہاتھ میں کھڑتالیں لئے ایک ساتھ گا رہے ہیں،

رادھے شیام، رادھے شیام ..... لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ ......

باقاعدگی تنظیم، اندھا پن، تہذیب اور طاقت کے ہزاروں راز اس رقت انگیز نظارے میں مستور تھے، ہر روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں جاتری اس مندر میں

آتے تھے اور بے شمار چڑھاوا چڑھتا تھا، سنا ہے کہ ان اندھے سادھوؤں کو صبح شام دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور ایک پیسہ دکشنا کا، باقی جو منافع ہوتا وہ ایک لحیم وشحیم پانڈے کی تجوری میں چلا جاتا، ایک اور مندر میں بھی میں نے ایسا ہی نظارہ دیکھا، فرق یہ تھا کہ یہاں اندھے سادھوؤں کے بجائے بے کس اور نادار عورتیں کرشن بھگوان کی اُستتی کر رہی تھیں۔ دن بھر اُستتی کرنے کے بعد انہیں بھی وہی راشن ملتا تھا جو اندھے سادھوؤں کے حِصّے میں آتا تھا۔ یعنی دو وقت کا کھانا اور ایک پیسہ دکشنا کا۔ ان اندھے سادھوؤں اور عورتوں کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے وشرام گھاٹ کے جاتری اور جمنا کے کیچڑ میں کلبلاتے ہوئے کچھوے یاد آ گئے۔ مذہب نے مندروں میں فیکٹریاں کھول رکھیں تھیں اور بھگوان کو لوہے سے بھی زیادہ مضبوط سلاخوں کے اندر بند کر دیا تھا، ہر مندر میں ہر ایک جاتری کو ضرور کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا، بعض دفعہ تو ایک ہی مندر میں مختلف جگہوں پر دکشنا ریٹ مختلف تھا۔ سیڑھیوں کو چھونے کے لئے ایک آنہ، مندر کی چوکھٹ تک آنے کے لئے چار آنے۔ مندر کا کواڑ اکثر بند رہتا تھا۔ اور ایک روپیہ دیکر جاتری مندر کے کواڑ کھول کر بھگوان کے درشن کر سکتا کئی ایک مندر ایسے تھے جو سال میں صرف ایک بار کھلتے ہیں اور کوئی

بڑا سیٹھ ہی اُن کی "بوہنی" کرسکتا تھا اور بہت سارو پیہ ادا کرکے مندر کے کواڑ کھول سکتا تھا، طوائفیت ہمارے سماج کا کتنا ضروری جزو ہے۔ اِس بات کا احساس مجھے ایسے مندروں ہی کو دیکھکر ہوا۔"

گوکل میں جمنا کے کنارے تین عورتیں ریت پر بیٹھی رو رہی تھیں، مارواڑ سے کرشن بھگوان کے درشن کرنے کو آئی تھیں، زیوروں میں لدی پھندی، ایک سادھو مہاتمانے انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسا لیا اور گیان دھیان کی باتیں کرتے کرتے انہیں مختلف مندروں میں لئے پھرے اور جب یہ مارواڑی عورتیں گوکل میں ماکھن چور کنھیا کا گھر دیکھنے آئیں تو یہ مہاتما بھی اُن کے ہمراہ ہولئے، عورتیں جمنا میں اشنان کر رہی تھیں، اور سادھو کنارے پر اُن کے زیوروں اور کپڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ جب عورتیں نہا دھو کر گھاٹ سے باہر نکلیں تو مہاتماجی غائب تھے، عورتیں سر پیٹنے لگیں کرشن جی اگر ماکھن چراتے تھے تو سادھو مہاتمانے اگر چند زیور چرالئے تو کونسا بُرا کام کیا۔ لیکن مہاتما کی یہ تک ان بے وقوف عورتوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اور وہ جمنا کی گیلی ریت پر بیٹھی مہاتماجی کو گالیاں دے رہی تھیں۔ بہت سے لوگ اُن کے آس پاس کھڑے تھے۔ اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

"جی بڑا ظلم ہوا ہے اِن غریب عورتوں کے ساتھ......"

"بھلا یہ گھر سے زیور لے کر ہی کیوں آئیں؟"

"اپنی امارت دکھانا چاہتی تھیں۔ اب رونا کس بات کا ہے....."

اجی صاحب شکر کیجئے ان کی جان بچ گئی۔ اب کل ہی متھرا میں ایک پانڈے نے اپنے ججمان اور اس کی بیوی کو اپنے گھر لیجا کر قتل کر دیا۔ ججمان کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا۔ بیوی کے پاس ساٹھ ستر ہزار کا زیور تھا...... کسی مدراسی جاگیردار کا لڑکا تھا۔ جی، اکلوتا لڑکا تھا...... اس کے باپ کو پولیس نے تار دیا ہے، خیال تو کیجئے کیسا اندھیر مچ رہا ہے اس پوتر نگری میں"

متھرا میں لوک سے نیاری ہی!"

بہت رات گئے میں اور میرا دوست جمنا کے اس پار کھیتوں میں گھومتے رہے۔ جنم اشٹمی کی رات تھی۔ پھوس کے جھونپڑیوں میں جن میں غریب مزدور اور کسان رہتے تھے، مٹی کے دیئے روشن تھے اور جمنا کے دوسرے کنارے گھاٹوں پر بجلی کے قمقمے اور برہمنوں کے قہقہوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ پھوس کے جھونپڑوں کے باہر مریل سی فاقہ زدہ گائیں بندھی تھیں اور نیم برہنہ لڑکے خاک میں کھیل رہے تھے۔ کنویں کی جگت پہ ایک بوڑھی عورت آہستہ آہستہ ڈول کھینچ رہی تھی۔ دو بڑی بڑی گاگریں

اس کے پاس پڑی تھیں۔ کنوئیں سے آگے آم کے درختوں کی قطار تھی جو بہت دور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ آم کے درخت اور آنولے کے پیڑ اور کھرنی کے مدور چھتنارے، یہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں ایک ہلکی اداس سی خوشبو تھی اور ستاروں کی روشنی ایسی جس میں سپیدی کے بجائے سیاہی زیادہ کھلی ہوئی تھی جیسے یہ روشنی کھل کر ہنسنا چاہتی ہے لیکن شام کی اداسی کو دیکھ کر رک جاتی ہے۔

میرے دوست نے آہستہ سے کہا۔ میں اور وہ کئی بار اُن کھرنی کے درختوں کے مدور سایوں میں ایک دوسرے کے ہات میں ہات دیئے گھومتے رہے ہیں ...... کتنی ہی جنم اشٹمیاں اس طرح گزر گئیں ...... اور آج ......!

میں خاموش رہا۔

چند دن ہوئے میرا دوست کہہ رہا تھا۔ مجھے قتل کے ایک مقدمے میں پیش ہونا پڑا۔ قاتل کو مقتول کی بیوی سے محبت تھی ...... اور جب اُسے پھانسی کا حکم سنایا گیا تو قاتل کسان نے جن حسرت بھری نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا، اُن نگاہوں کی وارفتگی اور گرسنگی ابھی تک میرے دل میں تیر کی طرح چبھی جاتی ہے۔

وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ سالہا سال ایک دوسرے سے پیار کرتے رہے۔ پھر لڑکی کے ماں باپ نے اسکی شادی کسی

دوسری جگہ کردی...... یہ جمنا پر لوگ محبت کے دیئے کس لئے جلاتے ہیں؟
..... بڑے ہوکر اپنے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کے گلے پر کس طرح چھری چلاتے ہیں
...... وہ کسان عورت اب پاگل خانے میں ہے......؟

میں نے کہا محبت بھی اکثر بے وفا ہوتی ہے۔ رادھا کو کرشن سے عشق تھا لیکن رادھا اور کرشن کے درمیان بادشاہت کی دیوار آگئی، اس نے کہا شاید تمہیں رادھا اور کرشن کی محبت کا انجام معلوم نہیں"

"نہیں" وہ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر آہستہ سے کہنے لگا......

...... کرشن جی نے برندابن کی گوپیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر برندابن میں آئیں گے اور ہر ایک گوپی کے گھر کا دروازہ تین بار کھٹکھٹائیں گے جس گھر میں روشنی ہوگی اور جو گوپی دروازہ کھٹکھٹانے پر اُن کا خیر مقدم کرے گی۔ وہ اُسی کے عشق کو سچا جانیں گے ـــــ اس بات کو کئی برس گزر گئے

ایک اندھیاری طوفانی رات میں جب بجلی کڑک رہی تھی اور بارش موسلا دھار برس رہی تھی کسی نے برندابن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کئے سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا اجنبی ہر ایک مکان پر تین بار دستک دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا...... لیکن سب مکانوں میں اندھیرا تھا۔ سب لوگ سوتے پڑے تھے۔ کسی نے اٹھ کر دروازہ نہ کھولا۔

اجنبی ناامید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ دور ـــــ ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے۔ وہ اُس جھونپڑی کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا۔ لیکن اسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی۔ کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں، رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے۔ چہرے پر لاتعداد جھریاں۔

کرشن جی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "رادھا میں آگیا ہوں۔"

لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی۔ دیئے کی لو کی طرف تکتی ہوئی۔

رادھا میں آگیا ہوں کرشن جی نے چلا کر کہا

لیکن رادھا نے کچھ نہ دیکھا۔ نہ سنا اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اسکی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں اور کان بہرے۔

..... زندگی سے پرے، موت سے پرے، انصاف سے پرے ......

میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میرا دوست اپنی باہوں میں سر چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ جیسے کسی نے اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو جیسے پاگل عورت محبت کرنے کے جرم میں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بستہ کر دی گئی ہو۔ زرد رو لڑکی وشرام گھاٹ پر حسرت بھری نگاہوں سے مٹی کے دیئوں کی لو کی طرف تک رہی تھی اس کی حیران پتلیاں میری آنکھوں کے

آگے ناچنے لگیں۔ اندھے سادھو سر منڈائے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور کھڑتالیں بجاتے ہوئے گا رہے تھے۔ رادھے شیام۔ رادھے شیام رادھے شیام ——— لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ رائٹ۔ پرانے خدا ابھی تک مندروں، بینکوں، فیکٹریوں اور کھیتوں پر قبضہ کئے بیٹھے تھے، وہ اپنے بہی کھاتے کھولے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اُن کی ننگی توندوں پر جینو لہرا رہے تھے اور وہ نہایت دلجمعی سے اُن لاکھوں آوازوں کو سن رہے تھے جو فضا میں چاروں طرف شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں....

.... رادھے شیام .... رادھے شیام ......"

چڑیا کا غلام

اُس کے لانبے قد سے نہ صرف اس کی بیوی کو کوفت ہوتی تھی بلکہ شہر کے مکان، چھتیں، دروازے تک اُس سے نالاں تھے۔ اگر اس لانبے قد کے ساتھ اس کا جسم بھی متناسب ہوتا تو خیر ایک بات تھی لیکن اُسکے جسم میں گوشت پوست ہڈیاں وغیرہ یعنی انسان کے دیگر اجزائے ترکیبی مقدار میں اس قدر کم تھے کہ چلتے وقت وہ بانس کی ایک ایسی لمبی پتلی شاخ نظر آتا جس کے سرے پر دو آنکھیں بندھی ہوں۔

اُسے اپنی آنکھوں پر بڑا ناز تھا۔ بڑی بڑی نوکیلی آنکھیں لیکن اسکے جسم کو دیکھکر اس کے متناسب اعضاء کا جائزہ لیتے ہوئے ہر فرد کو یہی گمان ہوتا تھا کہ ہو نہ ہو اس شخص نے کسی کی آنکھیں چرا کر اپنے چہرے پر

لگائی ہیں۔ کس قدر عجیب معلوم ہوتی تھیں وہ آنکھیں۔

آج اُس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا۔ سفید ڈک کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اور اس کے جسم کی چوٹی پر ایک سیاہ فیلٹ نمایاں تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بجلی کے کھمبے پر کوا بیٹھا ہے۔ اس ہیئت کذائی میں جبکی بوالعجبی کا اُسے مطلق احساس نہ تھا وہ اپنی اینگلو انڈین محبوبہ کے مکان گیا جو مال اسٹریٹ کے جنوبی چوک میں دائیں سڑک کی پہلی بائیں گلی کے دوسرے دائیں گھر میں رہتی تھی (اب بھی وہیں رہتی ہے اس لئے میں نے پورا پتہ لکھ دیا ہے کہ شاید کبھی آپ ......) جینی جوانی کی حدود سے گزر کر ادھیڑ پنے میں جا رہی تھی اور پھر دن رات شراب، سینما، ناچ، گورے یا کبھی کبھار اُس کا ہندوستانی عاشق، جب کبھی اُس کا ہندوستانی عاشق اس کے گھر آتا تھا، محلے کی کرسٹان کالی کلوٹی چھوکریاں اُسے تین چار دن تک بہت پریشان کیا کرتی۔ جینی تمہارے نیٹو محبوب کا کیا حال ہے کیسا ہے وہ،

وہ آج بہت خوش تھا، پہلی تاریخ تھی۔ جیب میں سکے کھنکھنا رہے تھے اور دس روپیوں کے نئے نوٹ اپنی مخصوص خوش آیند آواز پیدا کر رہے تھے، وہ آج اپنی محبوبہ کے ساتھ کسی ٹول میں پکچر دیکھے گا..... شفقیہ سین پر اس کا بوسہ لے گا...... اور اتنے ہی بوسے لے گا

جتنے اس تصویر میں ہونگے۔ اس کے بعد وہ پی کنگ چینی رسٹوران میں دھنیا، پیاز، گاجر اور کیڑوں مکوڑوں کی ملی جلی بھجیا اڑائیں گے..... پران وا فو فو....... اور پھر..... پائنزوی لوکان...... یہ چینی باورچی کتنے ہوشیار ہوتے ہیں۔ جو اشیاء خوردنی ہم نکمی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ انہی چیزوں سے یہ ایسی خوبصورت خوش ذائقہ پکوان تیار کرتے ہیں کہ چوگنے دام دینے پر بھی متلی نہیں ہوتی..... جی بالکل نہیں گھبراتا..... وہ جب اس طرح اپنے حسین سپنوں سے کھیلتا ہوا، آپ ہی آپ مسکراتا ہوا، گلی کے اندر گھوم کر دوسرے دائیں گھر میں داخل ہوا تو اس نے دو کرسٹان چھوکریوں کے قہقہوں کی آواز سنی، وہ دو ٹامیو نکے بازوؤں سے لگی ہوئی چلی جارہی تھیں، کالے کالے پاؤں میں اونچی ایڑی کے سفید جوتے کیا بھلے معلوم ہوتے تھے...... اسے دیکھ کر بولیں۔

...... جینی کا نیٹو محبوب...... ہی ہی ہی...... جینی......

جینی نے یہ آوازے سن لئے۔ وہ پی رہی تھی۔ اور غصے میں تھی، یہ نوجوان لڑکیاں پیارے پیارے سرخ و سپید ٹامیوں کو لئے ہوئے چلی جارہی تھیں اور آج اسکی قسمت میں.......

”جینی!“ بالس کی شاخ نے نہایت پیار سے کہا۔

جینی رخصت لئے ہوئے تھی۔ آنکھیں لال، چہرہ سوجا سوجا سہ

وہ حیران رہ گیا ـــ جینی کیا بات ہے۔؟

ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ

اُس نے جیب میں سے روپیئے نکالے، مسکرا کر کہنے لگا......

بھول گئیں؟ آج پہلی تاریخ ہے، پکچر! پی کنگ... پھر ینڈگارڈن کی سیر اور......

جینی نے روپیئے اور نوٹ اٹھا کر اپنی بلاوز میں ڈال لئے، بولی

دفع ہو جاؤ۔ میں آج تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی!"

کیوں ڈارلنگ؟

وہ اسکی بلائیں لینے لگا۔

اچھا دیکھو ڈارلنگ ـــ یکایک جینی نے نہایت مسکین لہجے میں کہا تم گھر چلے جاؤ ـــ یہ آنکھوں کا سرمہ دھو ڈالو ـــ یہ سپید ڈک کی پتلون تبدیل کر آؤ۔ اور یہ کالی ہیٹ بھی..... اس..... اس لباس میں ..... تم بالکل چڑیا کے غلام معلوم ہوتے ہو!"

یہ کہکر جینی نے دونوں ہات اپنے کولھوں پر رکھ لئے اور بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

مان اسٹریٹ میں کیخسرو کیخسرو اینڈ کیخسرو کی دکان میں نئے کھلونے آئے تھے۔ دو چھوٹے لڑکے نمائشی دریچے کے شیشے سے اپنا چہرہ لگائے حیرت سے اس کھلونے کی طرف دیکھ رہے تھے جو دریچے کے اندر ایک لکڑی کے اسٹول پر کھڑا دائیں بائیں سر ہلاتا جاتا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

ایک لڑکے نے کہا — یہ کھلونا میں لونگا۔

دوسرا بولا — نہیں، یہ کھلونا میں لونگا۔

پہلے لڑکے نے کہا — تم کیسے لوگے؟ کیا تمہارے پاس سات رنگوں والا بنٹا ہے؟ یہ کہکر اس نے اپنی جیب میں سے وہ بنٹا نکالا اور اپنی ہتیلی پہ رکھکر دوسرے لڑکے کو دکھانے لگا۔

دوسرے لڑکے نے اپنی جیب میں ہات ڈالا، اور پھر اسکی آنکھوں کے قریب لیجا کر اپنی مٹھی کھول دی، اسکی ہتیلی پر بالکل ایک ایسا ہی خوبصورت بنٹا چمک رہا تھا۔

پہلا لڑکا بولا — میرے پاس لوہے کی چھ انچ لمبی کیل ہے۔ یہ دیکھو

دوسرے لڑکے نے کہا — میرے پاس سیپ کا چاقو ہے۔ یہ دیکھو

پہلے لڑکے نے کہا — تمہارے باپ کی ناک ٹیڑھی ہے۔

دوسرے لڑکے نے کہا — تمہارا باپ گلی کا جھتر معلوم ہوتا ہے۔

اور ان دونوں نے وہیں لڑنا شروع کر دیا۔

وہ چیخنے، چلانے اور رونے لگے۔ لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ اتنے میں ان لڑکوں کی مائیں نعل کی دکان سے باہر نکل آئیں اور ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگیں، تیرے لڑکے نے میرے لڑکے کو پیٹا۔ نہیں تیرے لڑکے نے میرے لڑکے کو گھونسا دکھایا...... تو کہاں کی نواب زادی بن کر آئی ہے۔؟ ...... دونوں عورتوں نے وہ شور مچایا، وہ شور مچایا کہ سارا راستہ بند ہو گیا، پولیس کا سپاہی جو جھگڑا چکانے آ رہا تھا۔ راستے میں ملٹری کے ایک سپاہی سے الجھ پڑا، ملٹری کے سپاہی نے اُسے ایک بھرپور گالی دی۔ پولیس والے نے ڈنڈے کا ایک بھرپور وار اُس کے سر پر رسید کیا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے، تانگے۔ موٹریں لاریاں، دونوں طرف رک گئیں۔

ایک پیلے کارڈ والا بولا ـــــ ارے اپنے اس سالے شور لے کے چھکڑے کو آگے نکال۔

دوسرا ڈرائیور بولا ـــــ ابے دیکھتا نہیں، راستہ بند ہے۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ نئی گاڑی کو چھکڑا کہتا ہے اور اس اپنے پرانے نکمے ماڈل کو نہیں دیکھتا۔ پتہ نہیں کس کباڑیئے سے پرانے پرزے لے کر

موٹر کھڑی کر لی ہے۔!

تجھے موٹر کھڑی کرنے کا مزہ چکھاؤں؟ پے کارڈ والا بولا۔

ہات تو لگا، ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ سالہ سرمایہ دار ہوگا، اپنے گھر ہوگا! دوسرے نے آستین چڑھاتے کہا۔ سالے حرام زادے!

وہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ ان دونوں کو لڑتے دیکھکر دو تین آدمی لڑائی بند کرانے کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن پھر فطری طریق پر خود آپس ہی میں الجھ پڑے۔ گھونسے، طمانچے، تو تو میں میں۔ شور وغل، ہاتھا پائی، سڑک کے کنارے پان والے کی دکان کے قریب ایک ٹھنگنا موٹا آدمی ایک لمبا سگار منہ میں لئے نہایت اطمینان سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک نہایت دبلا بدصورت آدمی اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا، اس نے سفید پتلون پہنی ہوئی تھی اور کالی ہیٹ اس کے سر پر رکھی ہوئی تھی۔ سگار والے خوش پوش آدمی نے ایک لمحے کے لئے اسکی طرف دیکھا اور پھر بہ انداز تنفر اپنی توند دوسری طرف پھیر لی۔

چند لمحوں تک وہ دونوں وہیں چپ کھڑے رہے۔ اور شور وغل بڑھتا گیا، پھر یکایک ایک تیز گھونسا موٹے آدمی کی توند پر پڑا اور اس کا

سگار منہ سے نکل کر موری میں جا پڑا۔ موٹے آدمی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اور وہ حیرت سے دیکھنے لگا کہ وہی دُبلا پتلا آدمی آستین چڑھائے اُسے پیٹ رہا ہے اور دانت پیس پیس کر کہہ رہا ہے...... مجھے چڑیا کا غلام کہتا ہے سالے، میں چڑیا کا غلام ہوں۔ اور تو کون ہے بدمعاش، میں تجھے ابھی چڑیا کا غلام.........!"

کیخسرو کیخسرو اینڈ کیخسرو کی دکان کے نمائشی دریچے میں وہ کھلونا اسٹول پر کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اور سر ہلا رہا تھا۔ دائیں، بائیں...
..... دائیں، بائیں........

مثبت اور منفی

قلفی ملائی

پُرانے خلا

چند دائرے نیلے پیلے لال، گلابی، نارنجی، ارغوانی، میں نے کہا شاہد بھیّا، وہ مسکرائے، مرزا صاحب سر کھجانے لگے، شفق دور ہوتی گئی اور سمندر کا پانی چیخنے لگا، کنہیا لعل، کنہیا لعل۔ تم بڑے گدھے ہو، مرزا صاحب سر کھجانے لگے۔ کالے کالے بالوں نے بدنما کرنجی پھوڑوں کو چھپا لیا تھا، اور پھر چاروں طرف فضا میں تارے فوّاروں کی طرح قہقہے لگانے لگے، اور موسیقی کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر جب برف گرنے لگی، تب بھی شاہد بھیّا مسکراتے رہے اور برف کے گالے بظاہر سپید، لیکن کس قدر نفیس، نازک نقش، ایسی پچی کاری تو تاج محل میں بھی موجود نہ تھی، دراڑیں، سنولاپن، اور پھر تاج کے سامنے ایک اور کالا تاج بننا شروع ہوا تھا، اور صدیوں کے بعد کئی صدیوں کے بعد تاج کے

گنبد کے گرد لکڑی کے بڑے بڑے کھمبے سربلند کئے ہوئے نظر آئے، شاہجہاں کسی بنگالی مصور کی بنائی ہوئی تصویر میں بستر مرگ پر پڑا تاج کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تاج جس کے گرد لکڑی کے بڑے بڑے بدنما کھمبے گڑھے تھے، اسے ممتاز محل نظر نہ آتی تھی، حکیم غائب تھے۔ ایک مغلانی سر دابنے لگی، مرزا صاحب سر کھجانے لگے اُف رے۔ ان بالوں میں کس قدر کھجلی ہوتی ہے۔ یہ بھورے بھورے پکتے ہوئے پھوڑے۔ شامی کبابوں کی بو اس کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی، شاہد بھائی اُنکی طرف دیکھکر مسکرا رہے تھے۔ اور یکایک لال لال لاوا اُس کے قدموں میں بہنے لگا اور اس نے چیخ مار کر اپنے پاؤں پرے ہٹانے چاہے۔ لیکن لاوا نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا اور لاکھوں اور کروڑوں چونٹیاں رہگذار میں رینگتی ہوئی چلی جا رہی تھیں، اور وہ کسی بڑے ملک کے دیو کی طرح ایک طرف کھڑا اس ننھی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان چونٹیوں کے گھر تھے، بیوی، بچے، غلام، اوسط درجے کی حیوانی تہذیب کے سارے لوازم، اور اُس نے گھبرا کر اپنا پاؤں رہگذار میں رکھدیا اور درجنوں غالباً سینکڑوں چونٹیاں چشم زدن میں اسکے پاؤں تلے کچلی گئیں۔ پاؤں کا بوجھ، یا کہ قسمت، یا کہ مثبت و منفی کا عملیہ یکایک زندگی موت کے دروازے میں پا۔ بجولال نظر آئی، اور شیطان قہقہے لگا رہا تھا۔ اور سمندر کا پانی چاروں طرف پھیلتا گیا، پھولے ہوئے سفید سفید

بادبان، جیسے نذیر کے نتھنے، اور وہ جمائی لینے لگا، اور شاہد مسکرانے لگے، یہ مسکراہٹ اسے بار بار ٹوک دیتی، نیلی سی مسکراہٹ جو بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اسے اس مسکراہٹ میں لال، پیلے، نیلے، گلابی، نارنجی، ارغوانی دائرے گھومتے ہوئے نظر آئے، اور مرکز نگاہ سیاہی مائل ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ یہ سیاہی پھیلتی پھیلتی یکایک پھٹ گئی، اور تاروں کے جھرمٹ میں چاند کا جھولا نظر آیا، اور اندر نے اپنا تخت چھوڑ کر اہلیا کے نرم اور گداز بازوؤں میں پناہ لی، رہگذار پر اب صرف ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ اور چیونٹیوں کی ایک کالی سی لکیر اس کے قریب سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی، رام اور لکشمن دونوں اس پتھر کے قریب پہونچے تو پتھر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میرا قصور معاف کر دیجئے۔ میں عورت ہوں، میرا نام اہلیا بائی ہے، میں رشی پتنی ہوں، مجھے راجہ اندر نے ورغلا لیا تھا۔ رام نے مسکرا کر اپنا پاؤں پتھر پر رکھا۔ اور کالے کالے بالوں کی لٹیں ان کنول کی طرح پاکیزہ پاؤں سے لپٹ گئیں، اور چیونٹیاں زور زور سے چیخنے لگیں، اے رام، تم نے ایک پاؤں کی جنبش سے اہلیا کو زندگی بخشی، لیکن دوسرے پاؤں سے درجنوں چیونٹیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔" مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، عورت اور مرد، سفیدی اور سیاہی، خوشی اور غمی، زندگی اور موت، نیکی اور بدی، عقل اور بیوقوفی، ہو سکتا ہے کہ جس کو میں نے

عقل سمجھا ہو، وہ بیوقوفی ہو، جو بدی ہے وہ دراصل نیکی ہے۔ جو موت ہے وہ دراصل زندگی ہے۔ کنہیا لال کا زرد چہرہ یکایک کھل اٹھا۔ اُس نے زور سے کہا۔ تم نرے گدھے ہو۔ شاہد بھائی مسکرانے لگے۔ مرزا صاحب سر کھجانے لگے۔ ریگستان میں وہ حجازی ابھی تک نماز پڑھ رہا تھا۔ اور اس کا اونٹ ابھی تک مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاہجہاں کی آنکھیں بند ہوگئیں، اور جمنا کی آغوش میں تاج کا مرمریں گنبد۔ ایک کنول کے پھول کی طرح درخشاں نظر آیا لہروں میں بھنور پیدا ہوا، اور پھول نے رقص کرنا شروع کیا، رقصاں، حیراں لرزاں، بھئی خوب، کیا شعر کہا ہے۔ واللہ، بیت الغزل،

"تیرے لئے جہان میں چین ہے نہ قرار ہے"

پیانو پر بلی بیٹھی ہوئی خُرخُر کر رہی تھی، آ جا مانو بلی، ملائم سمور جیسے عورت کی جلد، تیز ناخن جیسے عورت کی فطرت، ناخن سموروں میں چھپے ہوئے، پالش کئے ہوئے، ازلی، ابدی، دوامی، مستقل پالش، جو پالش سے بے نیاز ہو، وہ عورت ہی نہیں، جو بیک وقت چھ عاشقوں سے محبت نہ کرسکے وہ حسین نہیں، جو کبھی چوہا ہی نہ پکڑ سکے اُسے بلی کون کہے گا، میاؤں میاؤں، آ جا مانو بلی۔۔۔ بلی اچک کر سبز مخمل سے منڈھی ہوئی کرسی پر جا بیٹھی۔ اور پیانو کے سُر دور سے بج اُٹھے۔ تارا را لا را را ری ری...... فضا میں پرواز کرتے گئے۔

بطوں کی طرح وہ اپنی چونچوں سے فضا کے جسم کو زخمی کر رہے تھے۔ اور خوشی سے چلّا رہے تھے۔ میں اُن کوا ور فضا کے گہرے گھاؤ کو دیکھنے لگا۔ اختیار تسلسل، مزاحمت اور زخم، مثبت اور منفی، کہر بائی رَو۔ پپ پپ پپ برقی رو حرکت کرنے لگی، اور آواز کے نشتر فضا کے جسم میں برمے کی طرح سوراخ کرتے گئے، میں دودھ پیتا مجنوں نہیں، مجنوں نے کہا، اور چاقو سے اپنا سینہ چھید ڈالا، اور لہو کی دھار ریگستان میں بہہ نکلی، سوئے حجاز، نہیں سوئے مراکش نہیں سوئے کوئے لیلےٰ محمل سجا ہوا جو بعزم سفر ہے۔ آج مجنوں کمبخت اگر کشمیر میں پیدا ہوا ہوتا تو لیلےٰ کا رنگ سیب کی طرح سُرخ ہوتا۔ ایک ہرے رنگ کے طوطے نے نذیر کے نتھنے میں گھس کر کہا۔ ٹیں۔ ٹیں۔ سٹ پٹ۔ پنیچی چتر سبحان سب کا داتا نذیر نے زور سے چھینک ماری اور حیران ہو کر کہا۔ سبحان تیری قدرت، اور شریر طوطا ایک سبز قینچی کی طرح اپنے پر پھیلا کر شہتوت کی ڈالی سے لٹک گیا، مرجھائے ہوئے، گلے سڑے شہتوت بکھرے پڑے تھے۔ اور بھنگن کی چھوٹی لڑکی انہیں چن چن کر کھا رہی تھی، خاک اُس کے ہونٹوں سے لگی ہوئی تھی اور گھاس کے تنکوں پر شبنم کے موتی سوئے ہوئے تھے۔ ایسے بے سُدھ کہ نہ وہ طوطے کی چیخیں سن رہے تھے، نہ مرجھائے ہوئے شہتوت کے نوحے اور لڑکی کے لبوں پر مٹی لگی ہوئی تھی، اور وہ مٹی میں سنے ہوئے شہتوت کھا رہی

تھی۔ کیونکہ مکھن ایک سپید ٹکیہ میں ملبوس ہو کر ایک چینی کی پیالی میں ڈال کر
ایک چمچے کے ساتھ سرخ سُرخ پتلے پتلے لبوں میں گھل جاتا ہے اور غریب
لڑکی مٹی میں سنے ہوئے شہتوت کھا رہی تھی۔ اور غریب بچھڑی چلا رہی تھی
کیونکہ اس کی ماں کے تھنوں میں سے مکھن نکال لیا گیا تھا۔ اور مکھن کھانیوالی
عورت ایک نہایت لطیف مسکراہٹ سے ایک سپید براق رومال سے اپنے
نازک پنکھڑیوں کی طرح پتلے ہونٹ صاف کر رہی تھی، جب ایک لڑکی مٹی
کھاتی ہے، جب ایک بچھڑی دن رات بھوکی ڈکراتی ہے، تو ایسی دلفریب
مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی۔ اخلاق بولا۔ واہ
کیا شعر کہا ہے۔ خوب کہا۔ ہے ہے۔ مکرر ارشاد۔ لیکن شاہجہاں مر چکا تھا۔
اور اس کے بیٹے تخت و تاج کے لئے آپس میں جھگڑ رہے تھے، اور زمین اور
آسمان گلے ملنے لگے، اور کائنات تنگ ہوتی گئی اور اندھیرا چاروں طرف
بڑھتا گیا۔ اور زمین اور آسمان دونوں طرف سے آگے بڑھ رہے تھے اور
بیچ میں ایک تنگ سی گلی بن گئی تھی۔ اور یہ گلی ہر لحظہ تنگ ہوتی جا رہی تھی
اور خوف سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور شیطان کا سایہ چاروں طرف پھیل گیا
تھا اور روشنی کی ایک پتلی سی لکیر رہ گئی تھی اور تاریکی دونوں طرف سے
برابر بڑھتی آ رہی تھی اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ یقیناً

پس جائے گا، تاریکی کے مہیب قدموں میں چیونٹی کی طرح کچلا جائے گا، پن چکی کے پاٹوں میں گندم کے آخری دانے کی طرح، تاریک بھنور میں زندگی کے آخری تنکے کی طرح، اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تاریکی چاروں طرف چھا گئی، اور ہر طرف اجالا ہی اجالا ہو گیا! اور موسیقی کا سمندر اسکی ترسی ہوئی روح کے گوشے گوشے میں لہریں لینے لگا، جیسے کائنات کا غیر مرئی ہاتھ اسکا ماتھا چوم رہا تھا، جیسے وہ خوشگھاس کے تنکے پر سوئے ہوئے شبنم کے آخری قطرے کی طرح تھا۔ اور سورج کی پہلی کرن اسے دعوت نظارہ دے رہی تھی اور اس نے آنکھیں کھول دیں اور اسے اپنے ظاہر میں اور اپنے باطن میں اور چاروں طرف ایک دھنک تنی ہوئی نظر آئی۔ اس قوس و قزح میں ہزاروں رنگ تھے۔ لاکھوں قہقہے، کروڑوں مسرتیں، پانی کے بلبلے ایک دوسرے کو ریلتے، پیلتے، ڈھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور چیونٹیوں کی قطار اک گول دائرہ بن گئی اور تسبیح کے اس دائرہ میں لاکھوں بلبلے گندھے ہوئے تھے؛ مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، نیم دروں، نیم بروں، ڈھاکے کی ململ، اور تانبے کی دیگ میں ایک ابلا ہوا انسان، یا اللہ یہ بادشاہت کیا کچھ کراتی ہے۔ یا اللہ یہ محبت کیا کچھ دکھاتی ہے؛ انسان بھی آلو کی طرح ابالا جا سکتا ہے۔ آلو میں بھی نشاستہ ہوتا ہے اور انسان کے جسم بھی، پھر وہ لوگ جو

آلوؤں کی جگہ انسان ابال کر کھاتے ہیں، کیونکہ گردن زدنی ہیں۔ جو نیکی ہے وہ بدی ہے جو بدی ہے وہ نیکی ہے۔ نیکی کہاں ہے۔ بدی کیسی ہے۔ آلو یا انسان؟ لہو کی ندیاں اور سلاخوں پر آنتیں۔ اور ایک پھٹا ہوا پرزہ، میری ماں، میری پیاری اماں، میں راضی خوشی ہوں، میرے بچے میں ہمیشہ تیرے لئے دعا کرتی ہوں۔ پیارے بھیّا، تم سدا جیتے رہو، میرے مالک تیرا بیٹا اب دو برس کا ہوگیا ہے۔ اور تجھے ابا۔ آ جا ابا۔ کہکر پکارتا ہے، اور کاغذ کا پرزہ ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ ہوا کے سینے میں شگاف پیدا کر دیتا ہے اور ہوا چلاتی ہے اور اک وحشیانہ، اندھے جوش سے مدافعت کرتی ہے۔ اور کاغذ چھلنی ہو جاتا ہے، اور لیوس گن کی تڑاتڑ، اور کمانڈر کہتا ہے۔ آگے بڑھو بہادر سپاہیو، اور دشمن کا سینہ چھلنی کر دو۔ یہ کس کا سینہ ہے؟ تمہارا یا میرا۔ یہ سینہ جس میں سے لہو کی دھار بہہ رہی ہے۔ یہ ایکس رے کی مشین ہے۔ یا لیوس گن؟ اے فولاد کی دنیا، اپنے قدموں کے مہیب سایوں میں انسانی چونٹیوں کی رینگتی ہوئی قطار دیکھ۔ اس کا نوحہ سن۔ اس کے کچلے ہوئے اجسام دیکھ، قطار اندر قطار، جیسے کالے کالے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن اور دائرے بڑھتے چلے جا رہے ہیں، اور تاج کا عکس جمنا کے فرش آب پر رقص کر رہا ہے۔ رقصاں حیراں، لرزاں، صدیوں کی سطوت اسکی آنکھوں میں گھُلی ہوئی ہے اُسکی

زلفوں میں بسی ہوئی ہے، ملبوسات میں رچی ہوتی ہے۔ کاش تجھے دیمک کھا جائے
تیرا مرمریں آئینہ آنسو بنکر جمنا کی آنکھ سے ڈھلک پڑے، تیرا اس فولاد کی دنیا
میں کیا کام، جا اپنی روتی ہوئی انسانی محبت کی داستان اُس رُوح کو سنا،
جس کی ابھی تخلیق نہیں ہوئی۔ اُس زمانے کو دکھا جو ابھی آیا نہیں، اس تہذیب
پر عیاں کر جو ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ جاتی نہیں لگاؤں ہنٹر؟ واللہ طبیعت
پھڑک اٹھی، استاد کیا داؤں مارا ہے۔ موتی چُور سے زلیسکو کو گرا یا ہے، پہلوان
ہو میاں۔ جسم میں نشاستہ زیادہ ہے، یعنی آلویت نشاستہ تو سنگ مرمریں
بھی بہت ہوتا ہے۔ تو گویا تاج بھی نشاستہ کا ایک ڈھیر ہے۔ آلویت کا مظہر
کاش شاہجہاں سنگ مرمر کے بجائے آلو کا تاج بناتا تو اس سے محبت کی
تضحیک ہو جاتی، محبت میں اور نشاستے میں وہی نسبت ہے۔ جو موت اور
زندگی میں، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی، کیوں جھگڑا کرتے ہو جی، ہندو اور
مسلمان، سکھ اور عیسائی، ہندوستان اور پاکستان۔ مثبت اور منفی، مثبت
اور منفی، لہریں بھاگتی ہوئی جا رہی ہیں۔ ہر لہر کی رفتار ہوتی ہے۔ ہر رفتار میں
حرکت ہوتی ہے۔ ہر حرکت مارے کو زخمی کرتی ہے۔ اگر ایک چیز آگے بڑھتی
ہے تو دوسری چیز پیچھے ہٹتی ہے۔ اگر ایک شئے گرم ہوتی ہے تو دوسری ٹھنڈی
ہو جاتی ہے۔ وہ تاریک ہو جاتی ہے تو یہ روشن ہو جاتی ہے۔ وہ مرجاتی ہے تو

یہ زندہ ہو جاتی ہے بابر اور ہمایوں، مثبت اور منفی، بادشاہت اور رعایا، تارے دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سوکھی آنکھوں میں لوٹنے لگے۔ یا اللہ نیند کیوں نہیں آتی۔ ساری دنیا سو رہی ہے، کیا اسلئے مجھے نیند نہیں آتی، بلبلیں چہچہا کر خاموش ہوگئیں، پھول نے دن بھر چہک چہک کر اپنی پنکھڑیاں پتّوں کی آغوش میں ڈالدیں۔ اب وہ ٹہنی نے سے لگا سو رہا ہے۔ جیسے بچہ اپنی ماں کے کندھے سے۔ پیارے پیارے ننّھے مُنّے پھول۔ مجھے اپنے سینے کی ڈھڑکن میں چھپالے، اپنی خاموش موسیقیت کی گہرائیوں میں گم کرلے۔ تجھ پر ساری کائنات کی مسرتیں نثار، میں تیرے سائے تلے اپنی پلکیں بند کرلینا چاہتا ہوں، تاکہ صبح میں ان ستاروں کو دیکھ سکوں جو سورج کی آمد سے پہلے دبے قدموں تیرے حضور میں آتے ہیں اور تجھے شبنم کی مالا پہنا جاتے ہیں۔ سو رہا ہے تو آرام سے سکھ کی نیند سو، ترے سائے تلے بھی میری پلکیں حیران ہیں۔ آنکھیں خشک ہیں اور کان توپوں کے نغمے کو سن رہے ہیں۔ فولاد نے اک نئی موسیقی پیدا کی ہے۔ جب کلیجے چھلنی ہوتے ہیں تو نغمہ اُبلتا ہے۔ جب غریب بچی مٹی میں سنے ہوئے پھل کھاتی ہے۔ تو میری محبوبہ کے لبوں پر تبسم کھیلتا ہے۔ تو وہ معصوم پھول تو اس تضاد سے آگاہ نہیں، مثبت اور منفی، مثبت اور منفی.....

دھم دھم تارے ہی تارے۔ لہریں ہی لہریں، تاریکی، سمندر، کچھ بھی نہیں....

جھیل سے پہلے

جھیل کے بعد

جو سڑک سری نگر سے گل مرگ کی طرف جاتی ہے۔ وہ دو رویہ شمشاد کے خوبصورت پیڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ سڑک دھان کے کھیتوں کے بیچ میں سے گذرتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کی نرم روندیاں دھان کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی بہہ رہی ہیں۔ کھیتوں کے کنارے جہاں کہیں پانی کھڑا ہے یا چلتا پھرتا تھم سا گیا ہے وہاں کنول اور نکھن پیالے کھلے ہوئے ہیں۔ سپید، گلابی، زرد، کہیں کہیں چناروں کے نیچے گڈریئے گائیں بھیڑیں چرا رہے ہیں۔ چار چار عورتوں کی ٹولیاں گیت گاتی ہوئی دھان کوٹ رہی ہیں۔ ایک عورت سر پر گھڑا اٹھائے پانی بھرنے جا رہی ہے۔ لاری کو دیکھ کر یونہی بلا وجہ ہنس پڑتی ہے۔ اس کے موتیوں سے سپید دانت بہت

عرصہ تک آنکھوں میں، پھر تخیل میں لرزتے رہتے ہیں۔

جو سڑک ٹنگ مرگ سے گل مرگ کو جاتی ہے وہ صرف تین میل لمبی ہے اس سڑک پر انگریز مرد اور عورتیں عمدہ گھوڑوں پر سوار نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھوری رنگت والے کشمیری ہانپتے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں کسی کے ہاتھ میں ٹوکری ہوتی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تھرماس تو کسی کی گردن پر کسی میم صاحب کا بچہ مرد تسمہ پا کی طرح سوار ہوتا ہے۔ مزدور اپنی کمر پر ڈھائی من کا اسباب اٹھائے جھکے ہوئے چڑھائی چڑھتے جاتے ہیں۔ وہ پنچایت والوں کے وہ مقولے نہیں پڑھ سکے جو ٹنگ مرگ میں آتشک اور سوزاک کی دوائیوں کے اشتہار کی طرح جا بجا لگے ہوئے ہیں" مزدوری میں عزت ہے" مزدوری سے عار نہ کرو۔ مزدوری کرنا سیکھو۔ اس سڑک کے دو رویہ چیل اور دیودار کے تناور درخت ہیں۔ جن کے پاؤں میں سفید چھتریاں اور کھمبیں، اُگی ہوئی ہیں، بنفشے کے پھول ہیں سر سبزی کا سبزہ اور کسی دیوار پر شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے ہیں۔ اور سارا جنگل انکی مدھم آواز سے گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس شہد میں جنگلی پھولوں کی حلاوت ہوتی ہے۔ اور وہ مقوی وٹامن جیسے تیار کرتے وقت ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔

دو ننھے کشمیری لڑکے اس سڑک پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ گل مرگ سے

تھکے تھکے قدموں سے چل رہے ہیں۔ شاید گھر پہنچ کر ماں باپ بھی ناراض ہوں گے۔ شاید کھانا نہ ملے صرف چانٹے ہی ملیں۔ سڑک کے نیچے بہت دور تک شور مچاتا ہوا فیروز پور نالہ بہہ رہا ہے، نیلا پانی جس میں سفید سفید جھاگ ملی ہوئی ہے۔ نیلا جیسے ان کشمیری لڑکوں کی آنکھیں۔ سفید سفید جیسے لاری کی طرف دیکھتی ہوئی کشمیرن کے دانت۔ لیکن انڈے پھر بھی نہیں بکے۔

دس بارہ کشمیری لڑکیاں پیالی نما ٹوکریوں میں جنگل سے لکڑیاں اُٹھائے آ رہی ہیں۔ ان بڑی بڑی ٹوکریوں میں وہ ٹنگ مرگ کے رہنے والے سیاحوں اور تپ دق کے مریضوں کے لیے لکڑیاں چُن کر لا رہی ہیں۔ ان میں کئی لڑکیاں تپِ دق کے مریضوں کی طرح کھانس رہی رہی ہیں۔ کیونکہ لکڑیاں اُٹھاتے وقت جسم جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ ان لڑکیوں کی ٹانگیں بچپن ہی سے بھر کر بے ڈول ہو جاتی ہیں۔ چال میں ناہمواری، رخساروں میں گڑھے اور چھاتیوں میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں کبھی جوان نہیں ہوتیں۔ پہلے تو محض لڑکیاں ہوتی ہیں اور پھر ایک دم مائیں بن جاتی ہیں۔ جوانی کیا ہے۔ رس کیا ہے۔ جنگل میں شہد کی مکھی کس لیے پھولوں کی حلاوت جمع کرتی

ہے۔ کنول کیوں مسکراتے ہیں۔ مکھن پیالوں کی زرد زرد پتیاں تھمے ہوئے پانی کیوں لرزاں رہتے ہیں۔ انھیں ان باتوں کی سمجھ نہیں۔

جو سڑک نو ہزار فٹ کی بلندی پر گل مرگ کی وادی کے پیالہ کے گرد ایک زرکار فیتے کی طرح گھومتی جاتی ہے اسے سرکلر روڈ کہتے ہیں۔ یہاں سے سارے کشمیر کی وادی دکھائی دیتی ہے۔ سینکڑوں میل کا وسیع و عریض میدان چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جبکہ ابھی انسان پیدا نہ ہوا تھا ان پہاڑوں نے ایک نیلی جھیل کو گھیر رکھا تھا۔ چاروں طرف برف کے گلیشر ہوں گے اور بیچ میں یہ جھیل۔ جس کے نشان ابھی ڈل، ڈنر اور مانس بل کی جھیلوں میں ملتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اب بھی وہی پُرانی جھیل ہے، وہی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میں ہی وہ پہلا آدمی ہوں جو پُراسرار ما فوق الفطرت منظر کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر وہ جھیل کا پانی جیسے ایک دم کہیں غائب ہوجاتا ہے۔ اور وادی کا سبزہ اور اس کے مرغزار اور اس کے گاؤں اور شہر آنکھوں کے آگے پھیلتے جاتے ہیں۔ دیوداروں کا سناٹا فیروز پور نالے کے شور سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے اور زندگی

ہزاروں سال آگے کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اس سڑک پر میری ملاقات ایک آئرش لڑکی سے ہوتی ہے۔ نام ہے (Lira O Connor) لیرا او کانر۔ لیرا کی آنکھیں نہ نیلی ہیں نہ بھوری۔ نہ سبز۔ بلکہ ان تینوں سے ملتا جلتا ہوا کوئی اور رنگ۔ لیرا کی آنکھوں میں ایک عجب موہنی ہے۔ جیسے یہ آنکھیں ہمیشہ سپنے ہی دیکھا کرتی ہیں۔ لیرا کے بالوں کا رنگ پلاٹینم جیسا ہے۔ نازک، حسین، ریشمیں ان کے گرد اس نے ایک طلائی رومال باندھ رکھا ہے۔ وہ آرام سے بیٹھی درمیانہ دیوداروں کے چھتنار کے سایہ میں اس گھاٹی کا اسکیچ بنا رہی ہے جہاں درختوں کی جھنگوں کا ایک جال سا بنا ہوا ہے اور جس کے آخر میں ندی کے پانی کی ایک لکیر کھنچ گئی ہے۔

"یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اپنی راہ دیکھو۔"

میں نے اطمینان سے کہا۔ "یہاں سبز رنگ زیادہ گاڑھا ہے۔ پھولوں کے تختے اور دیوداروں کے جال کا تناسب صحیح نہیں خصوصاً یہاں تو ———"

"بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ٹھیک کرتی ہوں.... کیا تمھیں واٹر کلر کا شوق ہے؟"

"مجھے واٹر کلر سے عشق ہے۔ یوں سمجھئے کہ ابھی عشق ہوا ہے"
لیرا مسکرائی۔ اور پون گھنٹہ خاموش بیٹھی اسکیچ بناتی رہی۔
"مجھے بھوک لگی ہے اور میرے پاس صرف یہ چند بسکٹ ہیں"
لیرا نے ایک بسکٹ لبوں کے درمیان دیکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن" میں نے کہا۔ "میرے پاس یہ بھنا ہوا مرغ ہے۔ اس تھرماس میں۔ اور چند چپاتیاں بھی ہیں۔ اگر تمھیں ہندوستانی کھانے سے نفرت نہ ہو"
"ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو ہندوستان کا مرغ خاص طور پر کھاتی ہوں"
وہ شوق سے کھانے لگی۔ پھر بولی "اس میں Chillies بہت زیادہ ہیں۔ نہ جانے تم لوگ مرچیں اس قدر کیوں پسند کرتے ہو؟"
"یہ کھانے کا ذائقہ دو چند کر دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی جہاں اور ہر ایک حس مرچکی ہے وہاں ذائقہ کی حس ابھی برقرار ہے بلکہ متواتر فاقوں سے یہ حس اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ اس لیے سرخ مرچیں——"
"نہ جانے تم لوگوں میں یہ کیا عادت ہے" اس نے اپنے پلاٹینمی بالوں کو جھٹکا کر کہا۔ "کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات کرو۔ وہ ہر پھر کر سیاست پر آ جائے گا۔ میں سرخ مرچوں کا ذکر کر رہی تھی تم

اپنے وطن کی سیاست کا ذکر لے بیٹھے۔ نہ جانے کیا بات ہے! ... "
اس کے سُرخ لب غصّہ سے خمیدہ ہو گئے تھے۔

میں نے کہا "چلو، سُرخ مرچوں کے ذکر کو جانے دو۔ آؤ سرخ لبوں کا ذکر کریں۔ ان گلاب کے پھولوں کا جو تمھارے رخساروں پر کھلے ہوئے ہیں۔ اُن چاندی کی کرنوں کا جن سے تمھارے بال بنے ہیں۔ ان شپنوں کا جو تمھاری آنکھوں کی پتلیوں میں کانپ رہے ہیں۔ جیسے کسی خاموش جھرنے کی سطح پر ترناری کے حیراں و لرزاں پھول! "

.... دوسرے دن شام کو گل مرگ کے بازار میں لیرا اوکا نز گھوڑے پر سوار چلی جارہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اس نے مجھے لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب! ....

جو سڑک گل مرگ کی وادی کے بیچوں بیچ جاتی ہے۔ وہ گاف کورس کو درمیان میں قطع کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف انگریز مرد اور عورتیں گاف کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اور کشمیری ہاتو گاف کے سامان کے جھولے اور چھڑیاں اٹھائے ان کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اس سڑک پر گل مرگ کا کلب ہے۔ اور آگے چل کر عین وسط میں ایک اونچی جگہ پر امپریل بنک اور ینڈوز ہوٹل جاگیردارانہ نظام میں

اور اس سے پہلے جو اہمیت دھرم سالہ اور معبد خانہ کو تھی، اس مہاجنی نظام میں وہی اہمیت ہوٹل اور بنک کو حاصل ہے۔ نئے نظام کے نئے مظہر بیجاری الیننہ وہی ہیں۔

اس سڑک پر انگریز اور انگریز نما ہندوستانی گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں۔ کشمیری نوکر سرخ شلغم اور پیاز کے گٹھے اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔ انڈوں کی ٹوکریاں، مٹن، مٹر اور پھل اٹھائے لے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ان کے کھانے کے لیے نہیں ہیں۔ صاحب لوگوں کے بچوں نے ہیٹ پہن رکھے ہیں اور قیمتی اونی سوئٹر۔ میم صاحب لوگوں نے کارڈ مخمل کی بیش قیمت پتلونیں پہن رکھی ہیں جنھیں گل مرگ کے کشمیری درزیوں نے سیا ہے۔ لیکن یہ لوگ ان پتلونوں کو کبھی نہیں پہن سکتے۔ یہ لوگ صرف مزدوری کر سکتے ہیں جیسا کہ پنچایت کا فرمان ہے۔ "مزدوری میں عزت ہے"۔ "مزدوری میں عزت ہے"۔ "مزدوری میں عزت ہے"۔

اسی سڑک پر ایک ہا تو بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جوتے مرمت کرنے والا ہے۔ اور ایک گداگر۔ ہا تو پیلی پیلی پکی ہوئی ہاڑیوں کی ایک ٹوکری سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ یہ ہاڑیاں وہ اپنے کھیت کی مینڈھ پر اُگے ہوئے ہاڑی کے درخت سے اتار کر لایا ہے۔ اس کھیت میں

جو اناج تھا اسے زمیندار، بنئے اور حکومت نے رہن رکھ لیا ہے۔
ب دو تین ہاڑیوں اور سیبوں کے درخت باقی رہ گئے ہیں وہ ان کا
پھل گل مرگ لے جا کر بیچتا ہے۔ تاکہ وہ صاحب لوگوں کو ہاڑی اور
سیب کھلا کر اپنے بیوی بچوں کے لیے کچھ تھوڑے سے چاول خرید سکے۔
بداگر آلتی پالتی مارے بے حیائی سے پیسہ مانگ رہا ہے۔ جوتہ مرمت
کرنے والا ایک ایسا جوتہ مرمت کر رہا ہے جس کی قیمت پچاس روپے
سے کم نہ ہوگی۔ خود اس کے اپنے پاؤں ننگے ہیں۔ تلووں میں بیا یاں
پھوٹ آئی ہیں۔ اور ایک جگہ سے تو خون بھی بہہ رہا ہے۔ لیکن جوتوں کی
تو خیر قیمت بھی ہوتی ہے بھلا اس خون کی کیا قیمت ہوگی۔

ایک بوڑھی انگریز عورت اپنی رنگین چھتری گھما گھما کر اپنے ساتھ
چلنے والی دوسری عورت سے کہہ رہی ہے۔ مائی ڈیر تمھیں معلوم نہیں کہ
جب وہ ہندوستانی ہمارے کمرے میں گھس آیا تو مجھے کتنا ڈر معلوم ہوا۔
ڈر اور غصّہ میں بھاگ کر دوسرے کمپارٹمنٹ میں اپنے خاوند کے پاس
چلی گئی۔۔۔۔"

آج بہت دنوں کے بعد میں پھر اس سرکلر روڈ پر سیر کرنے کے لیے
نکلا ہوں۔ یہ جنگل بالکل خاموش ہے۔ کشمیر کی وادی پر سورج غروب ہو رہا

ہے۔ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے اور گھٹتی ہوئی روشنی کی ایک مسلسل شطرنج سی بنتی جا رہی ہے۔ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ اس وادی کی قسمت کیوں خاموش ہے۔ یہ جنگل اپنے بیٹے بیٹیوں کے لیے بھی نہیں بولتا۔ اس جنگل کا شہد اس کے اخروٹ، اس کے سیب، انڈے، لکڑی، اس کا ریشم، اس کی ساری خوبصورتی و رعنائی اس کی کوئی چیز بھی اپنے بیٹوں کے لیے نہیں، یہ کیسی خدائی ہے؟ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا "مزدوری نہ کرو" کارڈ مخمل کی پتلونیں پہنو۔ سیب کھاؤ۔ خوبانی اور اخروٹ کھاؤ۔ مزدوری کرنے سے انکار کر دو۔ گھوڑے کی سواری کرو۔ دندناتے پھرو۔ یہ زمین تمھاری ہے یہ آسمان تمھارا ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو آؤ اس ساری وادی کو ایک جھیل بنا دیں۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی جھیل جس میں ٹنگ مرگ اور گل مرگ سب سما جائیں۔ جس کے پانیوں میں انسانی بے رحمی کے جہنمی اور وحشی گھروندے سب فنا ہو جائیں۔ بس چاروں طرف وہی پرانی جھیل ہو، ہزاروں لاکھوں سالوں کی جھیل اور اس کے چاروں طرف وہی برف کے گلیشر اور برف سے لدے ہوئے پہاڑ کھڑے ہوں۔ تاکہ جب آسمان کی پہنائیوں سے سورج کی پہلی کرن جھیل کی سطح پر اترے تو مسرت سے چلا اٹھے۔ "شکر ہے ابھی انسان پیدا نہیں ہوا"

حادثے

اُن یادوں میں سے جو دل میں اُتر جاتی ہیں اور
ھلانے سے نہیں مٹتیں۔ بلکہ ہر بار تازہ ہو جاتی ہیں اور دل کے
ھاؤ کو اور بھی گہرا کر دیتی ہیں، ایک یاد میرے چھوٹے بھائی کا قتل
ہے، ہزار کوشش کرنے پر بھی میں اس واقعے کو نہیں بھولا ہوں،
ونہی، بیٹھے بٹھائے، دوستوں سے خوش فعلیاں کرتے ہوئے زندگی
ے حسین اور مسرت بھرے لمحوں کے درمیان یکایک میرے سامنے
یرے چھوٹے بھائی کا چہرہ آجاتا ہے۔ اور اُس کی بڑی بڑی آنکھیں،
انسوؤں سے بھری ہوئی، ٹرمٹر تکتی ہوئی، چپ چاپ مجھے دیر تک
ھورتی رہتی ہیں، اور میری مسرت اک دم غائب ہو جاتی ہے،
قہقہوں کے فوارے سوکھ جاتے ہیں، اور ہونٹوں کی مسکراہٹ

اس طرح مُرجھا جاتی ہے جس طرح تپتے ہوئے سُورج کی تیز دھوپ میں چنبیلی کا پھول، وہ میرا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اُس کا نام راجہ تھا۔ شکل و صورت سے بھی وہ کسی پرستان کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اتنا قبول صورت لڑکا بہت کم دیکھا ہے، شاید اسی لیے گھر کے سب بھائی بہن اُس سے نفرت کرتے تھے، آخر یہ اس قدر خوبصورت کیوں ہے اور قدرت نے اس قدر صاف رنگ، اتنی اچھی آنکھیں، اس قدر متناسب اعضا کیوں نہیں بخشے؟ اسی لیے ہم سب بھائی بہن اُس سے دل ہی دل میں جلتے تھے اور میں تو کسی نہ کسی بہانے اُس سے ہمیشہ لڑائی جھگڑا مول لینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ گو میں اُس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میں بی۔ اے میں لیکن اُس کی خوبصورتی نے میرے اندر اس قدر احساس کمتری پیدا کر دیا تھا۔ کہ میں ہر وقت سوچتا رہتا کہ جب یہ لونڈا میری عمر کو پہنچے گا تو یہ کتنا حسین جوان ہوگا۔ شکیل، طرحدار، خوبصورت اور جب یہ کالج جائے گا تو جہاں ہم لوگ بالکل بدھو اور گھسیارے سمجھے جاتے تھے اُس میدان میں اس کمبخت کی فتوحات بھلا سکندر اعظم

ے کیا کم ہوں گی۔ یہی سوچ سوچ کر میرا جی اندر ہی اندر گھٹنے
لگتا، اور میں اپنی ساری جلن اور نفرت اُس سے لڑنے جھگڑنے
ور موقع بے موقع اُس سے مار پیٹ کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔
راجہ بے حد ذہین، شریر، ضدی اور بد پرہیز تھا۔ اور ماں باپ کا
سب سے لاڈلا اور چہیتا بیٹا تھا۔ میرے والد تو خصوصاً اُس سے
س قدر محبت کرتے تھے۔ کہ ہمیشہ صبح و شام اُس کے ساتھ اکٹھے کھانا
ھاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر ہم لوگوں کو کس قدر ناگوار گزرتا ہو گا۔
پنی شرارتوں کی وجہ سے وہ اکثر پٹتا، اور اپنی بد پرہیز طبیعت کی
وجہ سے اکثر بیمار رہتا، چند ایک جنسی بیماریوں کو چھوڑ کر دنیا کی شاید
ہی کوئی ایسی بیماری ہو گی جو اُسے لاحق نہ ہوئی ہو۔ اور اُس کا
علاج کرتے کراتے گھر کے سب لوگ تقریباً خود ڈاکٹر بن چکے تھے۔
معمولی ملیریا سے نمونیا اور ٹائیفائیڈ تک ہر مرض کے نسخے زبانی یاد
ہو گئے تھے۔ لیکن ان تمام بیماریوں کے باوجود راجہ کے جسم میں مدافعت
کی اتنی شدید قوت تھی۔ کہ وہ ہر بیماری پر قابو پا لیتا، اور پھر
وہی اُس کا خوبصورت، مسکراتا ہوا چہرہ ہمیں چڑانے کے لیے، گھر
میں، گھر سے باہر، ہر جگہ موجود ہوتا، کہتا، دیکھو۔ تم کس قدر بدشکل ہو

بھونڈے، گنوار معلوم ہوتے ہو۔ اور میری طرف دیکھو۔ میں ہوں، راجہ، پریوں کا شہزادہ!....

اور اس قتل کی ابتدا ایک لڑکی کے مُسکرانے سے ہوئی۔

سجیا کیوں مسکرائی (اس لڑکی کا نام سجیا تھا) اِس کا جواب میرے پاس نہیں ہے، شاید اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ سجیا کیوں مُسکرائی، میں پوچھتا ہوں، میرے والد کی تبدیلی اس دُور اُفتادہ مقام کیوں ہوئی جہاں سجیا رہتی تھی، سجیا کیوں مسکرائی، سجیا اس قدر خوبصورت کیوں تھی۔ اُس مقام پر دو ندیاں کیوں بہتی تھیں۔ وہاں دیودار کے جنگلوں سے بھرے ہوئے پہاڑ کیوں تھے۔ وہاں کی آب و ہوا مرطوب کیوں تھی۔ وہاں چاول اس قدر افراط سے کیوں پیدا ہوتے تھے۔ وہاں کے لوگ خوشحال کیوں تھے۔ لڑکیاں جب پانی بھرنے گھڑے سروں پر اُٹھائے ہوئے گاتی ہوئی ایک قطار میں چلتی تھیں، تو دل کی گاگریں شباب کا کچا لہو کیوں چھلکنے لگتا تھا۔ اِس کا جواب کس کے پاس ہے؟ واقعات کے اس تسلسل کو سمجھنے کے لیے جس فلسفے کی ضرورت ہے وہ میں ابھی تک تخلیق نہیں کر سکا۔ نہ ہی وہ مجھے کہیں سے ابھی تک دستیاب ہو سکا ہے۔ اگر زندگی حوادث کے تسلسل کا نام ہے تو بے شک سجیا کے مسکرانے کو ایک حادثہ سمجھنا چاہیے۔

سجیا کو سب سے پہلے میں نے اپنے مکان کے باغ کی باڑھ پر کھڑے دیکھا تھا۔ شام ہوگئی تھی۔ شفق غائب ہو چکی تھی۔ اور وہ باڑھ کے کنارے باغ کے دروازے پر جو ناتراشیدہ لکڑیوں کا بنا ہوا تھا۔ اک کالی شلوار اور نیلی قمیص اور ملگجے دوپٹے میں کھڑی تھی۔ میں نے ٹہلتے ٹہلتے اُسے دیکھا۔

تم کون ہو۔

وہ جواب میں مُسکرائی۔

وہ پراسرار شرمائی ہوئی سی مُسکراہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ اُتنی ہی واضح اور روشن ہے۔ جتنا میرے بھائی کے قتل کا واقعہ، حیرت ہے۔ کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی حادثے کی کڑیاں کیسے ہوسکتی ہیں؟ جب وہ مُسکرائی تو مجھے اتنا تو ضرور معلوم ہوا کہ کوئی بہت بڑا حادثہ ضرور ہوا ہے۔ لیکن یہ گمان بھی نہ تھا۔ کہ اس حادثے سے میرے سوا اور کسی کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

سجیا کے اس عجیب تبسّم کے بعد اور بہت سی باتیں ہوئیں اُس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتی ہے وہ گاؤں یہاں سے دو دن کے فاصلے پر ہے۔ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔

کوئی دس پندرہ دن وہ اپنے عاشق کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتی رہی، جنگلوں میں چھپی رہی، پہلے پہل بہت لطف آیا تھا۔ ہر چیز رومانی اور پُرکیف معلوم ہوتی تھی۔ ایک دفعہ جب وہ بھوکے رہے۔ تو اس میں اک خاص لذّت تھی۔ اُس وقت پیاس میں بھی اک انوکھا مزہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ نشہ اُترتا گیا، وہ دونوں اِس چھپنے اور بھاگتے رہنے کی زندگی سے اکتا گئے، اور جب دو چار مسلسل فاقے برداشت کرنے پڑے۔ تو رومان اور عشق، اور جذبات کی بلاخیزیاں اُڑنچھو ہوگئیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہوگئے، نگاہیں چُرانے لگے، دونوں نے دل ہی دل میں ایک دوسرے کو صلواتیں سنانا شروع کیں، بعد میں کھلّم کھلا ایک دوسرے کو طعنے دینے لگے، مرد نے عورت کو پیٹا، اور سمجھا پھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب وہ واپس اپنے گھر لوٹ جانا چاہتی ہے۔ وہ تین دن سے بھوکی ہے۔ اُس نے یہ باغ دیکھا۔ اور یہ پکے ہوئے پھل۔ اس نے سوچا۔ کہ وہ کیوں اب بھوکی رہے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ آج رات اسی باغ میں رہے گی۔ اور مزے سے پھل کھائے گی۔ اور جب صبح ہوگی [illegible] سے چپ چاپ چلی جائے گی۔

LIBRARY

اِس کے بعد وہ پھر مُسکرائی۔

میں نے کہا۔ سجیا اب تم واپس اپنے گھر کیسے جاسکوگی۔ عین ممکن ہے کہ گاؤں والے تمھاری ناک کاٹ دیں۔ اور تم زندگی بھر نکٹی رہ کر اک بھکارن کی طرح در بدر گھومتی رہو۔

اب وہ مُسکراہٹ آنسوؤں میں تبدیل ہوگئی۔ یہ اک اور بہت بڑا حادثہ تھا۔ سجیا کہنے لگی۔

تو اب میں کیا کروں۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ میں نے وہ ترکیب اُسے بتادی۔ پہلے تو اُس نے سر ہلا کر انکار کیا۔ بعد میں رضامند ہوگئی۔ بے حد اچھی ترکیب تھی وہ۔ اس میں اُسی کا بھلا تھا۔ کہ بُرا صرف یہ ہوا۔ کہ جب میں اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ تو راجہ نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرے شریفانہ اطوار اور نیک چال چلن سے بخوبی واقف تھا۔ اور اس لیے مری حرکات وسکنات پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ بس یہی بہت بُرا ہوا۔ اور گو سجیا نے وہ رات باغ میں بسر کرنے کے بجائے باغ کے مالی کے گھر بسر کی۔ لیکن پھر بھی راجہ کو مجھ پر شک رہا۔ اور اُس نے صاف کہہ دیا۔ کہ اگر میں نے کوئی ایسی

ویسی حرکت کی تو وہ جھٹ گھر کے لوگوں کو مطلع کر دے گا۔ راجہ بے حد شریر تھا۔ میری زندگی کے حسین ترین چراغوں کو پھونک مار کر ہمیشہ کے لیے بجھا دینے کا سنہری کام اُسی کے ہاتوں سے پورا ہوا ہے۔

میرے کہنے سے مالی نے سجیا کو اپنے گھر جگہ دی، اور یہاں وہ مالی کی بھانجی بن کر رہنے لگی۔ اور ہمارے گھر کا اور باغ کا کام کرنے لگی، صرف راجہ اصل راز سے آگاہ تھا۔ اور اُس کا منہ بند کرنے کے لیے مجھے بہت سے وسیلے اختیار کرنے پڑتے۔ جس کی وجہ سے میں اُس کی طرف سے اور بھی پریشان ہوگیا۔ اور میری نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ پہلے تو میں شاید اُس سے جلتا تھا۔ لیکن اب تو یہ مکمل۔ شدید۔ سچی نفرت تھی۔ اس قدر لڑاکا۔ لالچی، جھوٹا، چغلخور، لڑکا تھا وہ۔ مجھے اس طرح پریشان کرتا تھا۔ کہ توبہ ہی بھلی۔ کھانا کھاتے ہوئے نہایت معصوم بن کر وہ کوئی ایسی ویسی بات کر دیتا کہ میری سٹی بٹی گم ہو جاتی۔ اور میں دل میں یہ سمجھتا۔ کہ اس کمبخت نے اب راز افشا کیا کہ اب کیا.....

چند روز اسی حالت میں گزرے۔ اور اس دوران میں سجیا

اور میں عشق و محبت کے اُن منازل کو طے کرنے لگے، جن کا تعلق چاندنی راتوں، اور ندی کے ترل پانی۔ اور بلبل کے چہچہوں اور چشمے کے کنارے کانپتی ہوئی پھولوں کی ڈالیوں سے ہے۔ ساری فضا میں شاعری رچ گئی تھی، اور میں تو جب محبت میں گرفتار ہوتا ہوں۔ تو بُری طرح ہوتا ہوں۔ شعر کہتا ہوں۔ روتا ہوں قے کرتا ہوں۔ زکام ہو جاتا ہے۔ بھوک مر جاتی ہے۔ عجیب مصیبت ہے یہ عشق لیکن شکر کا مقام ہے۔ کہ اس بیماری کی معیاد چھ ماہ سے زیادہ نہیں کم از کم مجھے تو چھ مہینے کے عرصے ہی میں نجات مل جاتی ہے!

لیکن یہاں تو ابھی یہ حادثہ شروع ہوا تھا۔ اور میرا یہ حال تھا۔ کہ بس یہ آخری حادثہ ہے۔ بحرِ محبت کا آخری ساحل ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ میں سبجیا سے شادی کر لوں گا۔ اب کسی اور سے محبت نہ کروں گا۔ زندگی امن و چین سے بسر ہو گی۔ میں حقہ پیوں گا۔ اور ایک درجن بچوں سے گھوڑا گاڑی کا دلچسپ کھیل کھیلا کروں گا۔ لیکن اب سنئے کیا ہوا۔ پہلا حادثہ تو یہ ہوا تھا کہ سبجیا مسکرائی تھی۔ اب یہ ہوا۔ کہ ندی سے میرا مطلب ہے۔ کہ جہاں ہم رہتے تھے۔ وہاں کی وادی میں بہنے والی ندیوں نے طغیانی پر آنے کی ٹھان لی۔ متواتر

تین دن وہ ابر و باران رہا۔ کہ ساری وادی میں جل تھل ہوگیا۔ بہت سے گاؤں بہہ گئے۔ ان میں سجیا کے باپ کا گاؤں بھی تھا۔ مگر خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل حادثہ تو یہ تھا۔ کہ ندیوں میں طغیانی آئی۔ بہت سے ڈھور ڈنگر بہ گئے۔ دیہات تباہ ہوئے۔ لوگ مرے۔ اور سجیا کے ماں باپ بھی مر گئے۔ اب سجیا کا میرے سوا کون تھا۔ اور گو وہ ابھی تک مالی کے گھر میں رہتی تھی۔ لیکن میں نے یہ دل میں ٹھان لی تھی۔ کہ اب کے گرمی کی یہ چھٹیاں ختم کر کے جب واپس کالج جاؤنگا۔ تو چپکے سے سجیا کو بھی اپنے ساتھ لیتا چلونگا۔ پھر میں اُسے ایک گھر لے دونگا۔ اور میں تھوڑے روز کالج جایا کرونگا۔ اور جب میں کالج سے لوٹ کر گھر آیا کرونگا۔ تو وہ دروازے پر میرا انتظار کرتے ہوئے اس طرح کھڑی ہوگی جس طرح ہندوستانی فلموں میں ہیروئین ہیرو کا انتظار کرتی ہے۔ آہا۔ بس مزے ہی مزے ہونگے۔ اور میں دل ہی دل میں گنگنانے لگا۔

"اک بنگلہ بنے نیارا"

بعد میں میں نے یہی بات سجیا سے کہہ دی۔ اور اُسے اک بنگلہ بنے نیارا والا گیت بھی سنایا۔ وہ یہ سب کچھ سُن کر بہت خوش ہوئی میں اُس کی خوشی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے

کی خوشی دیکھ کر بے حد خوش ہوئے، اتفاق سے راجہ نے بھی کہیں ہماری یہ باتیں سُن لیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی اس خوشخبری کو سُن کر کس قدر خوش ہوا ہوگا۔

اِس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اُسے میں حادثہ نہیں کہتا۔ قتل بھی نہیں کہتا۔ اپنی بدقسمتی کہتا ہوں۔ ہوا یہ کہ طغیانی دُور ہوتے پر جبکہ ندیوں کا پانی ابھی تک گدلا گدلا تھا۔ اور مرے ہوئے جانوروں اور ڈھور ڈنگروں کی بدبو اُس میں آتی تھی۔ شیطان راجہ نے اُن پانیوں میں نہانے کی ٹھانی وہ بہت دیر تک اُس گندے پانی میں نہاتا رہا۔ تیرتا رہا۔ اور پانی کی کلیاں کرتا رہا۔ غالباً بہت سا پانی اپنی خرمستیوں کے دوران میں اُس کے پیٹ میں چلا گیا۔ جس کا نتیجہ ہوا۔ کہ اُسی شام کو اُسے بخار ہو گیا۔ اور سارے بدن پر سوجن ہو گئی۔

پھر یہ سوجن بڑھتی گئی۔

اور بڑھی۔ حتیٰ کہ اُس کا سارا جسم پھول کر کُپا ہو گیا۔ خوبصورت آنکھیں سوجے ہوئے پپوٹوں میں چھُپ گئیں۔ شریر لب پھٹے ہوئے انجیر نظر آنے لگے۔ ہاتھ پاؤں نیلے، کالے، پیلے، جو سب سے شکیل تھا۔ وہ سب سے بدصورت ہو گیا۔ اس سے ہم سب بھائی بہنوں کو تسکین

ہوئی۔ ایک گونہ۔ میں بظاہر اُس کی بیماری پر کڑھتا تھا۔ لیکن خوش بھی تھا۔ کیونکہ اب کوئی نگہداشت کرنے والا نہ تھا۔ اور چاندنی راتیں تھیں اور راجہ بستر سے اُٹھ نہ سکتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا۔ کہ اس بیماری کے دوران میں وہ میرا راز کبھی افشا نہ کریگا۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ اور مجھ پر اپنا شکنجہ ہمیشہ کے لیے مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ راز افشا کرکے اُسے کیا مل جاتا۔

ڈاکٹر نے اُس کا علاج کیا۔ لیکن وہ اچھا نہ ہوا۔ سوجن بڑھتی گئی۔ ایک اور ڈاکٹر کو شہر سے بُلایا۔ سوجن کم ہونے لگی۔ کم ہوتے ہوتے تقریباً تقریباً ناپید ہوگئی۔ ماں باپ بے حد خوش ہوئے۔ ہم بھی تھوڑے سے خوش ہوئے۔ پھر دوسرے دن وہ بیمار پڑ گیا۔ اور پھر سوجن بڑھنے لگی۔

اس طرح پانچ بار سوجن کم ہوئی۔ اور بڑھی۔ ڈاکٹر نے بڑی تندہی سے علاج کیا۔ لیکن یہ سوجن ہمیشہ گھٹتی بڑھتی تھی۔ اور کسی طرح دُور نہ ہوتی تھی۔ اس لمبی بیماری کے دوران میں اُس کا پھول کا سا حسن مرگیا۔ ہونٹوں پر سیاہی۔ رخساروں پر چھائیاں۔ اور شریر آنکھوں میں اُداسی آگئی۔ راجہ وہ راجہ نہ رہا تھا۔ وہ اب پرستان کا شہزادہ نہ رہا تھا۔ بلکہ کسی بھوت پریوں کی بستی کا لڑکا۔ اس کی بدصورتی سے

بہت سے لوگوں کے دلوں کو تسکین سی ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تشویش بھی بڑھتی گئی۔ وہ اچھا تو ہو جائے۔ یہ سوجن کیوں نہیں گھٹتی؟

ڈاکٹر نے کہا۔ یہ جگہ بہت مرطوب ہے۔ اور اب موسم بھی خنک ہے۔ اور راجہ کو اوڈیما ہو گیا ہے۔ دل بے حد کمزور ہو گیا ہے۔ اگر اس کا علاج کسی خشک جگہ پر ہو سکتا، جہاں دھوپ بہت ہو اور سنگترے بافراط ملیں۔ تو یہ لڑکا بہت جلد اچھا ہو جائیگا۔

ماں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ جب میرا بڑا بیٹا پڑھنے کے لیے جائیگا۔ تو اسے اپنے ساتھ لے جائیگا۔ وہاں اس کا اچھی طرح سے علاج ہوگا۔ کھلی دھوپ ہوگی۔ اور میرے لال کو سنگترے بھی کھانے کو ملینگے۔ یہ کمبخت تو ایسی بُری جگہ ہے کہ یہاں نکمی ناشپاتیوں اور کیلوں کے سوا اور کچھ ملتا ہی نہیں۔

میں نے دل میں سوچا۔ میں راجہ کو ساتھ کیسے لے جا سکتا ہوں۔ میں تو سجیا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اگر راجہ بھی میرے ساتھ ہوا۔ تو سب راز افشا ہو جائیگا۔ اور یہ تو بہت ہی بُری بات ہوگی۔

والد صاحب بولے۔ میں اپنے بیٹے کو کہیں نہ بھیجونگا۔ میرا پیارا راجہ یہیں اچھا ہو جائیگا۔ کیوں ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر نے کہا۔ امید تو ہے۔ لیکن اگر.....

میں نے جلدی سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب اس کا دل کمزور ہے یسفر میں اگر خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو .....

والد صاحب بولے۔ ہاں۔ ہاں۔ یہ تو سوچئے۔

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ Risk تو ضرور ہے۔ مگر۔

مگر کیا؟ میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں یہ ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا۔ ہاں البتہ سنگترے میں وہاں سے پارسل کر دونگا۔

راجہ چپ چاپ ہماری سب باتیں سنتا رہا۔ اس کا سُوجا ہوا چہرہ بُدھ کی طرح تھا۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری

میرے والد نے اُس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ کیوں بیٹے۔ بڑے بھائی کے ساتھ جائیگا۔ لیکن راجہ نے کچھ نہ کہا وہ خاموش بیٹھا رہا۔

کئی دن بیت گئے۔ میری رخصت کے دن ختم ہو گئے۔ اب میں گھر والوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ راجہ بدستور بیمار تھا۔ وہ اچھا نہ ہوا تھا۔ لیکن اُس کی حالت بُری بھی نہ تھی۔ دل میں اک بار خیال آیا اسے ساتھ لے چلوں لیکن پھر فوراً ہی سجیا کا خیال دل پر غالب

آگیا۔ بیہودہ کہیں کا۔ راجہ اور سجیا دونوں کو ایک ہی مکان میں تو کیسے رکھ سکیگا۔ بے وقوف۔ جاہل! بس اب ہنسی خوشی سب سے رخصت ہو لے۔

رخصت ہوتے وقت میں نے اپنا ہاتھ راجہ کے سر پر رکھا۔ وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اُس نے مجھے نمستے کہا۔

میں نے کہا۔ راجہ بھیّا تم اچھے ہو جاؤ گے۔

ماں رُو رہی تھیں۔

والد صاحب بولے۔ ہاں۔ ہاں۔ راجہ بیٹا تم اچھے ہو جاؤ گے۔ لو اب مسکرا دو۔ تمہارا بڑا بھائی کالج جا رہا ہے۔ مسکرا کر اُسے الوداع کہو۔

راجہ نے اک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ نگاہ اب تک میرے سینے میں محفوظ ہے۔ برمے کی نوک کی طرح اندر کھٹکتی ہوئی ہے۔ میں اُسے ہر بار باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اُمید نہیں کبھی کامیاب ہو سکوں۔ یہ کہانی بھی اس کوشش کا نتیجہ ہے۔

لیکن راجہ والد صاحب کے کہنے پر بھی مسکرایا نہیں۔ چپ چاپ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہی۔ اور پھر کروٹ بدل کر

بستر پر لیٹ گیا

اور پھر اس واقعے کے پندرہ روز بعد مجھے وہ خواب میں ملا۔ میں نے دیکھا اُس کی ساری سوجن دُور ہو گئی ہے۔ اور اب وہ پہلے کی طرح بھلا چنگا ہے۔ قبول صورت ہے۔ شریر ہے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے۔ اُس نے اپنی باہوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے طنزاً کہا۔ بڑے بھیّا دیکھو۔ اب میں اچھا ہو گیا ہوں۔

میں نے کہا۔ راجہ میں بہت خوش ہوں۔ بے حد مسرور ہوں۔ اس کے بعد میری آنکھ کھُل گئی۔ اور میں نے یہ خواب سجیا کو سنایا۔ دوسرے دن تار ملا۔ راجہ اُسی رات کو مر گیا تھا۔ دل کی حرکت بند ہو جانے سے۔

....

میرا خیال ہے کہ میں راجہ کی موت کا ذمّہ دار نہیں ہوں۔ وہ اگر میرے ساتھ آ بھی جاتا تو نہ بچ سکتا۔ اُس کی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی۔ کہ اُس کا بچنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ اس لیے یہ اچھا ہوا۔ کہ وہ اپنے باپ کی گود میں مر گیا۔ اپنی شفیق ماں کی آنکھوں کے سامنے اِس دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ مجھے اُس کی موت کا قلق ہے۔

وہ میرا بھائی تھا۔ میں کئی بار اُس کی یاد میں رویا ہوں لیکن میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ میں قطعاً اُس کی موت کا ذمّہ دار نہیں۔

....

لیکن کبھی کبھی اُس کی سوئی سوجی سوجی آنکھیں مجھے رات کے اندھیرے میں گھورنے لگتی ہیں۔ ان آنکھوں میں نہ محبّت ہے۔ نہ نفرت۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہتیں۔ اُن کے لہجے میں کوئی شکوہ نہیں۔ شکایت نہیں۔ بس وہ مجھے صرف تکا کرتی ہیں۔ اور میں اکثر گھبرا جاتا ہوں۔ اور اُن نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتا۔ سوچتا ہوں۔ میں ہی اُس کا قاتل ہوں۔ میں نے ہی اُسے اُس گندی، مرطوب، خنک جگہ میں مرنے سڑنے دیا۔ جب میں اُس سے رخصت ہو رہا تھا۔ اور جب وہ چپ چاپ بُدھ بنا اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ تو اُس کے جسم کا رواں رواں، سُورج کی دھوپ، سنہری چمکدار دھوپ، اور خنک آب و ہوا اور سنگترے کے رس کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اور اُس کا جسم اُن چیزوں کو نہ حاصل کر سکا۔ اور فاقے کرتے کرتے مرگیا۔ ایڑیاں رگڑتے رگڑتے اُس کے نحیف جسم نے جان دی۔ کیونکہ سجیا مسکرائی تھی۔ اور سجیا میرے ساتھ تھی۔

....

اور آج جبکہ سجیا بھی میرے ساتھ نہیں ہے ذلیل۔ قحبہ خانے کی نذر ہو چکی ہے۔ اور میں اک کامیاب خوشحال تاجر ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں قاتل ہوں۔ میں نہیں نہیں میں قاتل نہیں ہوں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں۔ کہ کائینات کی کوئی قوت اُس وقت کو پھر واپس لادے۔ جبکہ راجہ بُدھ بنا ہوا بستر پر بیٹھا تھا۔ اور میں اُس سے الوداع کہہ رہا تھا... اے کائینات کے ظالم کمینے اندھے صدر اعظم.... اُن لمحات کو پھر واپس بلادے۔ صرف ایکبار۔ ..... صرف ایک بار!

غلاظت

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے

جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

لاریوں میں بھی سماجی زندگی کی طرح تین درجے ہوتے ہیں۔ "فرسٹ" "سکنڈ" اور "پبلک"، یعنی امرا، شرفا اور عامی یوں تو ہماری سماجی زندگی کی طرح لاری بھی ساری کی ساری گندی ہوتی ہے، غلاظت سے معمور، گرد و غبار اور پٹرول کی خطرناک بُو سے بھرپور، لیکن اس گندی اور غلیظ دنیا میں بھی لوگ تین چوبی تختے آر پار ڈال کر اُس میں جماعتی امتیاز پیدا کر لیتے ہیں۔ اور چند ٹکے زیادہ دے کر ایک ذلیل سے احساسِ برتری کے زیرِ سایہ اپنے دل کو تسکین بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی یہی کیا۔ اور کشمیر جانے والی لاری کے دوسرے درجے میں اپنے لیے جگہ مخصوص کرالی میں دراصل کھڑکی کے سامنے بیٹھنا چاہتا تھا۔ تاکہ لاری کی غلیظ دنیا میں

رہتے ہوئے بھی باہر کی خوشگوار فضا کے مزے لے سکوں، اس فریب نفس کو پورا کرنے کے لیے میں نے ایک اور فریب سے کام لیا۔ کیونکہ کھڑکی والی جگہ ایک سانولے رنگ کے کرسچین پولیس سارجنٹ کے لیے ریزرو ہو چکی تھی، اور مجھے کھڑکی کے قریب ضرور بیٹھنا تھا۔ چنانچہ میں نے پان والے کی دُکان سے دو پیسے کی الائچی اور دو لیموں خرید کر جیب میں ڈال لیے۔ اور خود دوسرے درجے میں آکر اُسی کھڑکی والی جگہ پر بُرا سامنہ بنا کر بیٹھ گیا۔ حسنِ اتفاق سے ابھی لاری کے چلنے میں چند منٹ باقی تھے، اور سانولے رنگ کا لمبا تڑنگا کرسچین پولس سارجنٹ لاری سے نیچے اُتر کر کچھ فاصلے پر اپنے کسی دوست سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس لیے وہ میری طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ ہاں جب لاری چلنے لگی۔ تو اُس نے بکمال شرافت مجھے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں نے جواب میں بکمال متانت اُسے الائچی کی پڑیا اور دو لیموں دکھا دیے۔ اور گویا اُسے اچھی طرح بتا دیا۔ کہ اگر وہ مجھے کھڑکی میں بیٹھنے نہ دیگا۔ تو میرے بار بار قے کرنے سے خود اُس کا جی بھی بُرا ہوگا۔ اور عین ممکن ہے۔ کہ اُس کے کپڑے بھی قے کی آلائش سے نہ بچ سکیں، میرے جواب سے کرسچین سارجنٹ

پورا مطمئن تو نہ ہوا، لیکن بے بس ضرور ہو گیا۔ اور میں یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ اس زندگی میں طمانیت کسے نصیب ہے؟ بے بسی چاہیے۔ کیونکہ پھر آدمی اپنی ساری تکلیفوں کے لیے کسی شقی القلب اور ظالم خدا کو ذمے دار ٹھہرا سکتا ہے۔ جس نے لاری میں قے کرنے والے آدمی بنائے تھے۔ کرسچین پولیس سارجنٹ کی یہ بے بسی چند لمحوں تک محدود رہی۔ کیونکہ اس کے بعد باتوں باتوں میں ہمیں پتہ چلا۔ کہ ہم دونوں ایک زمانہ گزرا۔ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد وہ پہلی مغائرت جاتی رہی اور ہم جلد ہی اُس لاری کی گندگی میں اس طرح گھل مل گئے۔ جس طرح مکھیاں غلاظت کے ڈھیر میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

اِس طرف اطمینان حاصل کر کے میں نے لاری کے اندر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ فرسٹ سیٹ پر یعنی امراء کے درجے میں ایک صاحب بہادر بیٹھے ہوئے پائپ پی رہے تھے۔ ایلفرڈ یا کیا نام تھا۔ اور پائیلٹ تھے۔ اور اب چوبیس دن کی چھٹی لے کر کشمیر جا رہے تھے۔ اُن کے پیچھے دوسرے درجے کی اگلی نشستوں پر لاری کے مالک کے خاندان کی دُہری ٹھوڑی والی دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ اُن کے ساتھ چار پانچ سال کی عمر والے دو لڑکے تھے۔ دوسرے

درجے کی پچھلی نشستوں پر میرے اور کرسچین پولیس سارجنٹ کے
علاوہ ایک سردار صاحب بیٹھے تھے اور اُن کی بیوی اور اُن کی
چھوٹی لڑکی بھی، اور ہمارے پیچھے یعنی عامیوں کے درجے میں
"پبلک" بیٹھی تھی۔ اس میں دو کسان، ایک بہرہ، دہری ٹھوڑی
والی عورتوں کی نوکرانی ایک کلینر، ایک دوکاندار جسے سیالکوٹ
جانا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت، گڑ کی بوریاں، مکھیاں، مسافر
کے اٹاچی کیس، تھرماس، سونٹیاں، چھتریاں، وغیرہ وغیرہ۔
میں نے سوچا یہ لاری ہماری سماجی زندگی کی نمائندگی بالکل صحیح تناسب
سے کرتی ہے۔ سب سے پیچھے کسان، کسان کے آگے بابو لوگ،
اُن کے بعد سرمایہ دار، سرمایہ دار کے اُوپر انگریز۔ انہی بنیادوں پر ہندوستان
کے موجودہ سماج کے اہرام بلند ہوئے تھے۔ لیکن ان اہرام کے
نیچے کس کی قبر موجود تھی۔ شاید ہماری اُسی زندگی کی۔ جسے ہم
کبھی دوبارہ نہ زندہ کر سکیں گے، اِن ممیوں میں اب کون روح
پھونک سکتا ہے۔ .....

جنگ کی وجہ سے پٹرول کمیاب ہے، اس لیے لاری پٹرول
اور اسپرٹ کی آمیزش سے چلائی جاتی ہے۔ لاری کو لاہور سے

چھ بجے روانہ ہونا تھا لیکن چھ بجے تک تو لاری کے مالک کے خاندان کی عورتیں بستر سے نہ اٹھی تھیں۔ اس لیے لاری نو بجے روانہ ہوئی۔ انگریز ہوا باز فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اور میں اور کرسچین پولیس سارجنٹ اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ کہ جس کی وجہ سے لاری تین گھنٹے دیر سے چلی۔ اِن دُہری ٹھوڑی والی عورتوں نے بہت سے سونے کے زیور پہن رکھے تھے۔ اُن کی جلد کی رنگت زیتونی تھی۔ اور غالباً اسی طرح ملائم (کیونکہ میں اُنھیں چھو کر تو دیکھ نہ سکا تھا) بڑی عورت کے ہونٹ غلافی تھے۔ رخساروں پر سیب کی سی سُرخی، آنکھوں میں خمار اور پلکوں کے گنجان سائے پر کاجل کی لکیر کا دھوکا ہوتا تھا۔ اُس کے بازوؤں کا گداز پن کبھی کبھی کرسچین سارجنٹ کو اس قدر متوجہ کر لیتا تھا۔ کہ اس کی آنکھوں میں ایک گرسنہ چمک پیدا ہو جاتی اور اُس کے موٹے موٹے ہونٹ کھل کر باہر لٹکنے لگتے۔ دوسری عورت شلوار کو ٹخنوں کے اُوپر کیے ڈرائیور کی سیٹ سے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں تو اچھی نہ تھیں۔ ہاں دانت بہت اچھے تھے۔ وہ بار بار ہنستی تھی۔ یا ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ پہلے پہل تو وہ

مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ گذر جانے پر مجھے معلوم ہوا کہ یہ مسکراہٹ دوامی تھی۔ کسی انگریزی صابون کے اشتہار کی طرح۔ آپ نے اکثر اُس عورت کو دیکھا ہوگا۔ جو بڑے بڑے شہروں کی دیواروں پر چسپاں ہمیشہ مسکراتی نظر آتی ہے۔ اور جس کے نیچے لکھا ہوتا ہے "ہمیشہ لکس صابون استعمال کیجیے"۔ ایسی عورت ہمیشہ دور سے اچھی لگتی ہے۔ اور تھوڑا عرصہ گذر جانے پر اُس کی مسکراہٹ دل پر گراں گزرنے لگتی ہے۔ ایسی عورت کو آپ دُور سے دیکھ سکتے ہیں۔ اُس سے محبت نہیں کر سکتے۔ بھلا کوئی آدمی ایک ایسے اشتہار سے کیسے محبت کر سکتا ہے، جو ہمیشہ مسکراتا ہوا نظر آئے۔ میں نے دل ہی دل میں اس عورت کے خاوند کو سراہا۔ جو ہر روز نہایت صبر و استقلال سے اس عورت کی مسکراہٹ کو برداشت کرتا تھا۔ یقیناً ایسے مرد کا مرتبہ غازی اور قومی شہید سے بھی بلند و ارفع ہے۔

اِن دُہری ٹھوڑی والی عورتوں کے ساتھ جو دو چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ اُنہیں بھی اس بات کا احساس تھا۔ کہ یہ لاری اُن کی ہے۔ یہ ڈرائیور یہ کلینر اُن کے ہیں۔ وہ جب چاہیں لاری ٹھہرا سکتے

ہیں۔ ڈرائیور اور کلینر کو جب چاہیں کان سے پکڑ کر باہر نکال سکتے ہیں۔
لاری کے مُسافروں کو بیجا تنگ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمیں بار بار پریشان
لیتے تھے۔ اور بڑی عورت سُرخ رخساروں والی، اپنے کان میں پڑے
ہوئے طلائی آویزوں کی ہلا کر کہتی معاف کرنا جی۔ یہ لڑکا بڑا شریر ہے۔
ہے نا۔ در اصل یہ لالہ جی کا پوتا ہے۔ سب سے بڑا پوتا۔ اور اس لیے
سارے خاندان میں اس کا حکم چلتا ہے۔ شاید اس عورت نے ہمیں بھی
اپنے خاندان کے غریب افراد متصور کر لیا تھا۔ اور دوسری عورت
بے وجہ مسکرا کر کہتی۔ ہائے بھب جی (بھابھی جان کا مخفف) میرا جی
چاہتا ہے۔ کہ کشمیر پہنچ کر کڑم کا ساگ کھاؤں۔ اے رام سنگھ، جب
ہم کُد پہنچیں تو مجھے یاد دلانا میں کُد سے کڑم کا ساگ خرید لوں گی۔
ہائے بھب جی۔ کڑم کا ساگ! اور پھر وہ اپنے لبوں سے ایک ہوائی
چُٹکی لے کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے ننگے ٹخنوں پر رکھ لیتی۔ اس طرح کہ
میرا جی بے اختیار چاہتا۔ کہ اُس کی موٹی گردن کو اپنے دونوں
ہاتھوں میں لے کر اُسے اِس طرح مروڑوں کہ نہ بھب جی رہیں۔ نہ
یہ کڑم کا ساگ۔ بڑی عورت کہتی۔ ساوتری۔ تجھے معلوم ہے۔
لالہ جی نے کشمیر کی ساری سڑک کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ تین لاکھ روپے

نفع ہوگا۔ یہ کہتے کہتے اُس کی دُہری ٹھوڑی پر اور شکن پڑ گئے۔ اور اُس نے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا۔ اور پھر پیچھے، اپنی نوکرانی کو آواز دے کر کہنے لگی۔ ذرا ننھے کے لیے دودھ اور گلوکوس ڈی بوتل میں رکھنا۔ اور دیکھنا جو سنی بالکل صاف ہو تب مجھے معلوم ہوا۔ کہ اُس نے اپنی رانوں کے درمیان دوپٹے کے نیچے لالہ جی کے ایک اور پوتے کو بھی دبا رکھا ہے۔ ایک اور ننھے سے سانپ کو۔ یہ بڑا پیارا خوبصورت بچہ تھا۔ جیسے سبھی ننھے سانپ ہوتے ہیں۔ اور جب اُس غلافی پپوٹوں والی عورت نے اُس ننھے سے بچے کو میری طرف بڑھا کر کہا۔ ذرا اسے ہماری نوکرانی کو دے دیجئے تب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میں واقعی لالہ جی کے خاندان کا کوئی غریب فرد تھا۔ نہ کہ لاری میں بیٹھا ہوا۔ ایک آزاد مسافر، جس نے اپنی جگہ دوسرے درجے میں روپے دے کر حاصل کی تھی۔

یہ سڑک جس پر لاری جا رہی تھی۔ لاہور سے گوجرانوالہ اور گوجرانوالہ سے سیالکوٹ اور سیالکوٹ سے جموں کی طرف جاتی تھی۔ گوجرانوالہ پہنچ کر یہ لاری چند لمحوں کے لیے رکی۔ اور اس میں پبلک کے درجے میں دو پولیس کے سپاہی داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ ایک

کھدر پوش ملزم بھی تھا۔ غالباً کوئی سیاسی قیدی، یا اسی قسم کا آوارہ مزاج سر پھرا، میں نے لاری سے اُتر کر تھوڑے سے آم خریدے، اور ایک چاقو کہ جس کا پھل بہت تیز تھا۔ اور جس کے دستے پر سیپ لگا تھا۔ کر یجین سارجنٹ نے تھرماس کھول کر برفیلا پانی پیا اور صاحب بہادر نے بیرے کو آواز دی کہ وہ انہیں بازار سے بسکٹوں کا ایک ڈبہ خرید کر لا دے، بیرے نے اپنے طرے کو اور بھی بلند کیا۔ اور اپنی قمیض کے سخت کالروں کو جن کے اندر کوئی ٹائی موجود نہ تھی۔ سہلاتا ہوا بازار کی طرف چل دیا۔

بس والوں کے ایجنٹ نے آکر مالکنوں کو سلام کیا۔ "کھانا کھایئے"۔ ڈرائیور بولا۔ "بی بی جی شربت منگواؤں" حلوائی بولا "تازہ پکوڑیاں ہیں" ایک خوانچہ فروش کچا ناریل لگائے آگے بڑھ آیا۔ ہمیشہ مسکرانے والی عورت بولی۔ "ہائے بھب جی، میرا جی چاہتا ہے کہ کچا ناریل کھاؤں۔ ایک دفعہ جب میں جموں میں گئی۔ تو مجھے وہاں کچا ناریل کھانے کو نہ ملا۔ پر ہائے بھب جی۔ میرا جی بار بار چاہتا ہے کہ کہیں سے کچا ناریل ملے۔ اور اُسے میں کھا جاؤں۔ اِس ناریل کا کیا بھاؤ ہے؟" "چار آنے پاؤ؟" "رام رام۔ تُو تو لوٹتا ہے۔ دو آنے

سیر دیگا۔ "نہیں بی بی جی" "اچھا دو آنے کا دے دے" ایک بوڑھا کاغذ کی ننھی ننھی چڑیاں بیچ رہا تھا۔ جو ربڑ کی ڈوریوں کے سہارے بار بار پُھدکتی تھیں۔ ننھے لڑکوں کو یہ چڑیاں بہت پسند آئیں۔ اُنھوں نے بوڑھے سے تین چار لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ اور انہیں ہلا ہلا کر ہوا میں لہرانے لگے۔ بھب جی کی نند کچا ناریل کھا رہی تھی۔ اور اُس کے ہونٹوں سے کُرکُر کی کراہت آمیز آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اور میرا جی چاہا کہ اِس عورت کو کچے ناریل کی طرح چبا جاؤں تاکہ یہ کُرکُر کی آواز تو نہ پیدا ہو۔ لیکن ..... پھر خیال آیا کہ موسیٰ بے وطن ہو جائیگا..... اتنے میں لاری چلنے لگی بوڑھا چلانے لگا۔ "میرے تین پیسے۔ ان لڑکوں نے تین چڑیاں".... لیکن لاری بہت آگے جا چکی تھی۔

کھدر پوش قیدی بکواس کرنے لگا۔ یہ اسی طرح غریبوں کو لوٹتے ہیں، ایک پیسہ، ایک ایک پیسہ کر کے، اُن کے خون کے قطرے جمع کرتے ہیں۔ اور پھر اسی خون کو اپنی بیویوں کے زرد رخساروں میں ڈال دیتے ہیں۔ اِسی وجہ سے تو ہمارے کسانوں کی بیویاں پچیس برس کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اور یہ لالہ جی کے خاندان

کی عورتیں چالیس برس گزر جانے پر بھی اسی طرح سیب کی طرح سُرخ رہتی ہیں۔

ڈرائیور نے گاڑی ٹھہرالی۔ اور بولا۔ اے پولیس کے سپاہیو۔ اپنے اس ملزم کے حواس درست کرو۔ ورنہ میں گاڑی سے نیچے اُتار دوں گا۔

بھب جی بولیں۔ نہایت متین انداز میں۔ "سیالکوٹ آلینے دو۔ وہاں لالہ جی کے پھوپھا کیپٹن جیارام بھچنده رہتے ہیں.... مزاج خود بخود درست ہوجائیگا۔" پھر وہ ساوتری سے باتیں کرنے میں مشغول ہوگئیں۔ "یہ پھوپھا پہلے صرف جمعدار تھے۔ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پاتے تھے یا شاید اس سے بھی کم۔ اور اب کیپٹن، پر بڑا کمینہ ہے یہ بھی۔ ایک دفعہ لالہ جی کو کچھ روپے کی ضرورت پڑی۔ اُس نے صاف انکار کردیا۔ لیکن آخر ہمارا رشتہ دار ہے۔ میرا خیال ہے ساوتری کہ جب لاری سیالکوٹ میں سے گذرے تو ہم ذرا ایک آدھ گھنٹہ کے لیے اُن کے ہاں سے ہو آئیں۔"

کھدر پوش قیدی بولا۔ میں یہ گاڑی کہیں ٹھہرنے نہ دونگا۔ یہ کیا مذاق ہے۔

ایک پولیس کے سپاہی نے اُسے ایک زبردست ٹھوکا دیا۔
"اپنی بکواس بند کرو۔ تم کون ہو نہ تین میں نہ تیرہ میں"۔
رام سنگھ ڈرائیور نے لاری کی رفتار تیز کر دی۔ گاڑی تیزی سے سیالکوٹ کی طرف بھاگی جا رہی تھی، نیم کی چھدری چھدری چھاؤں میں کہیں کہیں کالی بھینسیں جگالی کرتی ہوئی نظر آ جاتیں۔ اُن کی نگاہوں میں ایک ایسا سکون تھا۔ کہ جو لاری کے کسی مسافر کو نصیب نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر بھینس کا بھی ہوتا ہے۔ کالا، کیچڑ میں لت پت، جگالی آمیز لیکن اس نقطۂ نظر میں کس قدر تیقن ہے، کتنا سکون، مجھے شاید کشمیر جا کر بھی یہ آرام نہ مل سکے۔ یہ انگریز بار بار اپنی نشست پر بیٹھا ہوا بے چین ہوا جاتا تھا۔ سردار کی زرد رو بیوی نقاہت کی ماری ہوئی اپنے خاوند کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس طرح پینترے بدل رہی تھی، اور اس طرح منہ بنا رہی تھی، جیسے اُسے اسقاطِ حمل ہوا ہو۔ انگریز کا بیرہ ریاست پونچھ کی بولی میں اپنے صاحب کی بہادری کی داستانیں بیان کر رہا تھا، اور نوکرانی خالص ڈوگرے انداز میں اس پر حاشیہ آرائی کر رہی تھی۔ لیکن کھدر پوش قیدی سے

لے کر رام سنگھ ڈرائیور تک لاری کا ہر فرد بے چین اور کمینہ نظر آتا تھا۔ زیرِ نظر منظر میں اگر کوئی چیز پاک صاف، مقدس اور پُرسکون تھی۔ تو یہی بھینس جو کسی نیم کی چھاؤں میں جگالی کرتے نظر آجاتی۔ میں نے سوچا کہ آدمی آدمی کے بجائے بھینس ہوتا اور اسی طرح کسی نیم یا جامن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر جگالی کرتا، تو زندگی کس قدر آرام اور سکون سے بسر ہوتی، لیکن اب آدمی آدمی نہ تھا، ایک بھینس بھی نہ تھا۔ بلکہ ایک بیرہ ایک صاحب بہادر ایک قیدی، ایک سارجنٹ، نتیجہ یہ کہ زندگی کی لاری بھاگی جارہی ہے۔ اور ہم سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بے چین اور غیر مطمئن ہیں۔

یکایک گایوں کے ایک وسیع ریوڑ نے لاری کو روک لیا اور رام سنگھ نے لاری سے اُتر کر گوالے کو دو چار طمانچے جڑ دئیے حرامزادہ۔ عین سڑک کے بیچ میں گایوں کو لیے لیے پھرتا ہے جیسے یہ ڈپٹی کمشنر کا بچہ ہے۔ سالا، بدمعاش، گوالا حیران نگاہوں سے رام سنگھ کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ اُس نے لاری کو آتے دیکھا تھا۔ اور اُسی وقت سے دو گایوں کے ریوڑ کو ایک طرف کرنے میں مشغول ہوگیا تھا۔ اب اگر چند گائیں اُس کے منع کرنے پر بھی اِدھر اُدھر بکھر جائیں تو اُس میں اُس کا کیا قصور تھا۔ گوالے کی نگاہوں میں یہ سب کچھ تھا۔ التجا۔ انصاف کی التجا۔ اور اپنی بے بسی۔

اور بے چارگی ۔ کیونکہ انسانی سماج میں ڈرائیور کا مرتبہ ایک گوالے سے اونچا ہے۔ اور جو اونچا ہے وہ اپنے سے کم مرتبہ رکھنے والے کو مار پیٹ سکتا ہے۔ گالیاں دے سکتا ہے۔گوالے کی آنکھوں کی مجروح معصومیت اسی تلخ حقیقت کی آئینہ دار تھی۔

کھدر پوش قیدی رام سنگھ کو صلواتیں سنانے لگا۔تم خود ایک مزدور ہو۔ اور ایک غریب کسان پر ظلم کرتے ہو۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ ایک حاکم اُف ۔ یہ کس قدر جاہل ملک ہے۔ خدا کرے اس سارے ملک پر بجلی گر جائے ۔ دشمن کے بم اسے تباہ و برباد کردیں۔ اس کا ایک ایک گھر، گھر کی ایک ایک اینٹ، تباہ و مسمار ہو جائے۔ کچھ نہ رہے اس ملک کا۔ یہ گاندھی کا ملک ہے ؟ یہ ہندوستان ہے یا پاکستان ہے ؟ میرے خیال میں تو یہاں سب اُلو بستے ہیں۔قبروں کے اُلو۔

کھدر پوش کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور دونوں سپاہی اُسے دو ہتڑ کوٹنے لگے، یہ اُسی طرح گاؤں گاؤں بکواس کرتا ہے اور بغاوت پھیلاتا ہے ۔ حرامزادہ!"

کھدر پوش چلا چلا کر کہنے لگا ہاں، ہاں ۔ میں بغاوت پھیلاتا ہوں

مجھے مار ڈالو۔ مجھے جان سے مار ڈالو۔ میں سچّی بات کہتا ہوں اور سچّی بات کبھی کسی کو بُری معلوم نہ ہونی چاہیے ٹھیک ہے نا۔ اور مارو۔ میرے جسم کے قتلے کر ڈالو۔ لیکن میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ میری آواز خاموش نہیں رہ سکتی وہ ہندوستان کے کونے کونے میں گونجے گی۔

میں اور کرسچین پولیس سارجنٹ ہنسنے لگے۔

کھدر پوش ہماری طرف شعلہ بار نگاہوں سے تاکتا ہوا بولا۔ کمینو، مجھ پر ہنستے ہو۔ میں اب تک دس بار جیل میں جا چکا ہوں۔ میری بیوی تپِ دق سے مر گئی ہے، میرا لڑکا تعلیم سے محروم رہ کر جیب کترا بن گیا ہے۔ میری زمین قرق ہو کر نیلام ہو چکی ہے۔ مجھ پر ہنستے ہو، ظالمو، میں اب تمھیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم کبھی سرمایہ دار بن کر میرے سامنے آتے ہو۔ کبھی بابو بن کر، کبھی بنیا بن کر، کبھی پولیس سارجنٹ بن کر، کبھی لیڈر بن کر۔ لیکن تم ہو وہی۔ میں اب تمھیں اچھی طرح پہچان گیا ہوں۔ خون چوسنے والے چمگادڑ ....

پولیس کے سپاہی نے اُس کے منہ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔

رام سنگھ نے گاڑی کھڑی کر دی، سیالکوٹ شہر کی کچہری سامنے

تھی۔ اور ملزم اور سپاہیوں کو یہیں اُترنا تھا۔ سپاہی ملزم کو اُتارنے لگے۔

نوکرانی بولی۔ کوئی پاگل ہے پاگل۔

انگریز ہوا باز تیوری چڑھا کر اپنا پائپ سُلگانے لگا۔

ساوتری بولی۔ ہائے ببب جی۔ آپ کو یاد ہے نا اس کچہری کی عمارت ہمارے بابوجی نے بنوائی تھی!

سپاہی ملزم کو لیے کچہری کے اندر چلے گئے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک بڑا سا کھمبا لگا تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "کشمیر کو"، عفونت اور غلاظت سے بھری ہوئی یہ لاری کشمیر کو جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

مُقدّسْ

وہ بے حد شریف، باتونی، اور معصوم تھا، وہ اُن معدودے چند خوش قسمت آدمیوں میں سے تھا، جنہیں اپنی بیوی سے والہانہ محبّت ہوتی ہے، جو پرائی عورت کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ لیتے ہیں لیکن کوئی بُرا ارادہ دل میں نہیں رکھتے، بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ جھک مارتے ہیں سالے۔

اُس کی خوش قسمتی کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ بیوی شادی کے دوسرے ماہ حاملہ ہوگئی، اور جب فرزندِ ارجمند یعنی وہ ہر وقت رُونے بسورنے والا ننھا سا لونڈا معرضِ وجود میں آیا، تو اُس کی تبدیلی کسی دوسرے شہر میں ہوگئی، یہ شہر اُس کے وطن سے

پانسو میل کے فاصلے پر تھا۔ ناچار اُسے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر جانا پڑا، اس امر کا اُسے بہت قلق تھا۔ اور اکثر احباب کی محفل میں چوتھے پیگ کے بعد وہ اپنی حد سے زیادہ حسین بیوی اور خوبصورت بچے کا ذکر کرکے رویا کرتا۔

یہ شہر نیا تھا۔ یعنی اُس کے لیے نیا تھا، نوکری بھی نئی تھی، یعنی اُس کے لیے نئی تھی، تنخواہ کم تھی۔ یعنی — ہاں — بس سب کے لیے کم تھی، ہر وقت برخواست کیے جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بیوی کو بلانا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔ چند مہینوں کے بعد ——— البتہ ——— وہ ہر چند مہینوں کے بعد اسی طرح سوچتا، اس دوران میں اُس کی محبّت گہری ہوتی گئی، اُس کی شیفتگی، وارفتگی بڑھتی گئی۔

آہ، میں تمھیں کیسے بتاؤں، مجھے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے، میری بیوی تو ایک دیوی ہے، اس قدر پاکیزہ، مقدس، معصوم، حسین، جیسے کنول کا پھُول ..... اس شہر میں تو اُس جیسی ایک عورت بھی موجود نہیں!

وہ ہر روز اپنی بیوی کو ایک خط لکھتا۔ ہر روز اُس کی بیوی

اُسے ایک خط بھیجتی، ہر روز ڈاکخانوں میں اُن کے ارمان کا چرچا ہوتا۔
یوں بڑا خوش مذاق تھا، حسین اور طرحدار عورتوں کی خوبصورتی
اور اُس کی جزئیات کو ایک ماہر جوہری کی طرح پرکھ سکتا تھا۔ اُس
کی ٹانگیں مدوّر ہیں۔ گاؤدم ہیں، شفاف ہیں۔ گداز ہیں....
اُس کی سپیدی میں نئے ریشم کا نکھار ہے، ناک خنجر آبدار ہے...
اُس کی صباحت میں پکے ہوئے سیب کی دمک ہے، اُس کی
اٹھان میں غرور ہے، حیا بھی ہے۔ شوخی بھی ہے، کمر کولھوں سے
۴۵ ڈگری کا زاویہ بناتی ہے، جیومٹری کے اعتبار سے یہ دنیا بھر
میں سب سے متناسب کمر ہے، ... لیکن میری بیوی.....!

ایک سال گزر گیا۔

جنگ شروع ہو گئی

چیزیں گراں ہونے لگیں، اُس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ ضرور
ہوا تھا۔ لیکن قیمتوں میں اُس سے دگنا بلکہ اکثر حالتوں میں
چوگنا اضافہ ہوا تھا، اس کے اپنے شہر میں چیزیں ابھی اس قدر
گراں نہ ہوئی تھیں۔ اور پھر گھر اپنا تھا۔ کرایہ ادا نہ کرنا پڑتا تھا۔
لیکن اس نئے شہر میں تو .... یہاں وہ اپنے ایک دوست کے

ہاں اقامت پذیر تھا۔ مصلحت، جنگ، فراق ....!

اُس نے اپنی بیوی کو چار سو بار لکھا۔ مجھے تم سے بے انداز محبت ہے۔

اُس کی بیوی نے اُسے چار سو اور ایک بار لکھا۔ پیارے، ہم دونوں چاند اور چکور کی طرح ہیں۔

اُس نے اپنی بیوی کا خط پڑھ کر سوچا۔ یہ ٹھیک ہے، چاند اور چکور، کبھی چاند ہوتا ہے، تو چکور نہیں ہوتا، چکور ہو تو چاند نہیں ہوتا، دونوں ہوں تو کچھ اور مصیبت آجاتی ہے، بادل آجاتے ہیں، بارش ہونے لگتی ہے، جنگ شروع ہو جاتی ہے، تبادلہ ہو جاتا ہے۔

اُس نے اپنی بیوی کو لکھا۔ اپنی نئی تصویر بھیجو۔

تصویر آئی، احباب نے کنول کے پھول کو دیکھا اور گلیکسو بسکٹ یعنی بچّے کو بھی، دوست حاسد بن گئے، جلی کٹی سنانے لگے، وہ بہت خوش ہوا۔

ہر روز رات کو سونے سے پیشتر وہ اُن دونوں تصویروں کو سرہانے سے نکال کر دیکھتا، کلیجے سے لگاتا، پھر اُنھیں چومتا،

پھر بجلی کی بتی گل کر کے سوچا تا اور تخیل میں دیر تک اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہتا، آہ میری جان، مجھے تم سے ابدی محبت ہے، لازوال، کبھی نہ مرنے والی۔

دو سال گزر گئے، لیکن چھٹی نہ ملی۔

زندگی پھیکی ہوتی گئی۔ یادیں دھندلی ہوتی گئیں۔

سرِ شام وہ اپنے احباب کے ساتھ مال اسٹریٹ میں چکر لگاتا۔

ارے دیکھنا یار.... وہ پتلی چھریری سی لڑکی، وسنتہ، کیا کمان کا سا تنا ڈھے ... ارے وہ غالب کا شعر ہے نا!....

چند روز سے ایک پارسن بدھو کے پل پر گزرتی ہوئی مال سٹریٹ میں داخل ہوتی تھی، اور جنوبی چوک تک خراماں خراماں چلتی ہوئی پھر پل کی طرف لوٹ آتی تھی،.... وہ غزالیں آنکھیں، جیسے آنسوؤں سے دھوئی گئی ہوں، ... وہ شبنمی تبسم.... کمر کا وہ زہریلا لوچ....

چند روز وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اور اُس کے مقدس پاکیزہ معصوم تخیل میں بلبلے پھوٹنے لگے۔

کبھی تو وہ دھانی ساری میں ملبوس ہوتی، کبھی گہرے نیلے سائے میں، کبھی نیم عریاں گاؤن میں،.... ہر بار اُس کے سنورے ہوئے

بالوں کا ایک خاص انداز ہوتا.... اور وہ شبنمی تبسّم....
وہ گھورتے ہوئے، ٹکٹکی لگائے، اُس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ جیسے بے پٹرول موٹر، رسّی سے بندھی ہوئی، کسی تیز رفتار لاری کے پیچھے پیچھے بھاگتی جاتی ہے۔

چار پانچ روز کے بعد وہ پھر کبھی نظر نہ آئی۔

جب احباب نے پوچھا تو کہنے لگا، میری بیوی سے اُس کی شکل ملتی تھی، تم نے غور نہیں کیا؟... آہ، مجھے اپنی بیوی سے بے انداز محبّت ہے،.... در اصل بہت کم ایسی عورتیں ہیں جنہیں میرا مذاقِ سلیم.... کمبخت اپنا معیارِ حسن اب اتنا بلند ہو گیا ہے، کہ اب اوسط درجے کی حسین عورت بڑی مشکل سے جچتی ہے۔

احباب اُس وقت مان اسٹریٹ میں سے گزر رہے تھے۔
ایک نے پوچھا۔ اُس لڑکی کے متعلق، تمھارا کیا خیال ہے۔
بازو اچھے ہیں، لیکن چال میں توانائی نہیں۔
اور وہ..... جامنی سائے والی؟
گداز ہے، لیکن ذرا بھاری.... ذرا عمر زیادہ.....

ذرا ..... آہ، میری بیوی!

احباب ہنسنے لگے۔

ایک سال اور گزر گیا۔

اب وہ اکثر اکیلا گھوما کرتا، کیونکہ اُس کا معیارِ حسن بہت بلند ہو گیا تھا۔ اور بہت سے احباب مطلق تخیل پسند نہ تھے۔ اُن کی زندگی تجرباتی تھی، وہ غلطیوں کے قائل تھے۔ اُن کا فلسفہ بودا بلکہ ناپید تھا۔ اُنہیں اپنی بیویوں سے مطلق محبت نہ تھی، کیونکہ وہ شب و روز اُن کے ساتھ جونک کی طرح لپٹی ہوئی تھیں، اُن کے لیے ہر عورت جو اُن کی بیوی نہ تھی، حسین تھی۔

اب وہ اکیلا رہ گیا، مال اسٹریٹ میں لوسی کی ٹانگیں اُسے خطرناک حد تک پسند آنے لگیں، اور اُس کے دماغ کے دھندلکوں میں بار بار ناچنے لگیں۔ اُس کا جی چاہا وہ انہیں صرف ایک بار یوں ــ چھو کر دیکھ لے، .... لارا کی ٹھوڑی کا خم اُسے بہت بھلا معلوم ہونے لگا۔ اور کیبٹ کا اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گھما گھما کر پرغرور انداز میں سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنا ... اور جمشید جی لانڈری والے پارسی کی نوجوان بیوی کو لھوں کو کیسے چکی کے پاٹوں کی طرح

گھما گھما کر چلتی تھی، بھئی عجیب نشہ ہے اس میں، کیسی ڈھلی ڈھلائی لونڈیا ہے!

اور پھر سینما میں اُس نے امریکن سپاہی کے ساتھ جس شوخ کو دیکھا تھا۔ صرف چہرہ ہی اچھا تھا، لیکن ایمان سے کیا چہرہ تھا! اور پورے چہرے سے بھی نصف چہرہ.... ہئے ہئے.... وہ دانت کٹکٹانے لگتا۔ رُخ پر غازے کا ہلکا ہلکا سا غبار.... جیسے تازہ سیب کی نرم روئیں....

جی ہاں اُسے اپنی بیوی سے محبّت تھی، اُسے اوشی سے محبّت تھی، اُسے لارا سے محبّت تھی، اُسے کیٹ سے محبت تھی، اُسے لانڈری والے کی بیوی سے محبّت تھی، اُسے امریکن سپاہی کی محبوبہ سے محبّت تھی.... اور یہ محبّت کتنی سچّی، پاک، مقدّس، بے لوث محبت تھی۔

جب کبھی اُسے اپنی پاکیزہ محبّت کا خیال آتا، اُس کے گلے میں ہچکیاں تڑپنے لگیں، اور آنکھوں میں آنسو، آہ، اُس کے دل میں کس قدر محبّت تھی،

ایک سال اور گزر گیا۔

....

کرسمس کی رات تھی، مال اسٹریٹ کی چھوکریاں دُکانوں کی طرح سجی ہوئی تھیں، بجلی کی پاکیزہ روشنی معصوم چہرہ پر تھرک رہی تھی اور ناچ رہی تھی۔ چکا چکا بُوم چک، چکا چکا بُوم چک !.....

کرسمس کی رات تھی اور وہ چار سال سے ایک کنوارے کی طرح معصوم تھا۔ کیونکہ اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔

دوستوں نے کہا۔ آج کرسمس کی رات ہے، کل پھر نیا سال ہے، آؤ تم بھی زندگی کی آگ میں کود جاؤ !

وہ استہزایہ انداز میں بولا۔ تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے، .....اور پھر ہر شخص کا اپنا معیار ہوتا ہے !

وہ نکڑ پر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

سڑکیں، گلیاں، کوچے، بازار، کسی پُرانے، بکھرے اسٹیشن کی لائینوں کی طرح حدِ نگاہ میں بے ترتیب بکھرے پڑے تھے، وہ چلتا گیا اور اُس کے دماغ کے دھندلکے میں ناچ گھر کا شور اور خوشبوئیں، اور ٹانگیں اور سرسراتی ہوئی ساریاں، اور تھوڑیوں کے خم، اور لبوں کے تبسّم گھومتے گئے، اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتا گیا، آخر اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا گھر آگیا ہے۔ وہ رک گیا، پھر ٹھٹھک گیا،

گھر کی اندھیری دہلیز پر ایک عورت کھڑی تھی۔
اُس کی بیوی!
وہ مُسکرائی۔

. . . .

ایک عرصے کے بعد جب اُسے ذرا ہوش آیا تو اُسے محسوس ہوا کہ یہ اُس کا گھر نہیں ہے، اُس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی اور موٹے ہونٹوں والی عورت کو اپنی آغوش میں لیے شراب پی رہا ہے اور اُس سے بار بار کہہ رہا ہے، میری جان، پیاری، مجھے تم سے بے اندازہ محبّت ہے.... مجھے تم سے بے انداز محبت ہے۔ پاکیزہ.... سچّی.... مقدس.... بے لوث....!

رنڈی نے پھیکے بے جان لہجے میں کہا۔ ہاں! میں چاند .... تم چکور..... ذرا یہ ریڈیو تو کھولو!

پہلی اُڑان

جب سرکار نے عبداللہ کو ساگرہ میں پرائمری اسکول کھولنے کے لیے بھیجا تھا تو سب سے پہلے جس لڑکے نے اسکول میں داخل ہونے پر رضامندی ظاہر کی، وہ گلاب تھا گاؤں کا یتیم۔ اپنے چچا ست نرائن کی ریشہ دوانیوں کا شکار۔ وہ بہت جلد عبداللہ اور اُس کی بیوی بتول سے مانوس ہوگیا۔ اور خاص کر جب بتول نے اس سے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔" اور تم گلاب، تم میرے نام پر ہنستے ہو۔ اپنے نام کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ تمھارا نام تو ایسا ہے جیسے کسی مسلمان کا ہو... گلاب... گلاب ؟ بھلا گلاب بھی کسی برہمن کا نام ہوسکتا ہے؟"

گلاب یہ سُن کر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

پہلے پہل عبداللہ کو پرائمری اسکول کے لیے لڑکے اکٹھے کرنے میں بڑی دقّت پیش آئی۔ چند دنوں تک وہ بچارا اکیلا اسکول میں بیٹھا رہا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں پہاڑوں پر ڈنگر ڈھور لے جاتے روزمرّہ کا راستہ چھوڑ کر اسکول کی راہ لیتے۔ اور حیرت اور شوخی اور شرارت کے ملے جلے جذبات سے ماسٹر عبداللہ کی طرف دیکھتے۔ جو اُن کے ماں باپ کی طرح فرغل اور اونی چولا بھی نہیں پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے بال بھی بھیڑ کی اُون کی طرح نہیں کٹے ہوئے تھے۔ وہ کھدر کی ایک شلوار اور قمیض پہنے تھا۔ اور قمیض کے اُوپر اُس نے ایک کوٹ پہن رکھا تھا، جو فرغل کے نصف سے بھی کم تھا۔ اور جس پر نہایت دلفریب چوکور دھاریاں بنی ہوئی تھیں ہا۔ ہا۔ ہا۔ اور اس کی لمبی سی ناک۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔

"ارے یہ ناک ہے یا گھسی ہوئی پُول[1]؟"

[1] پُول کشمیری دھان کی بنی ہوئی چپل کو کہتے ہیں جسے گاؤں کے غریب کسان اور مزدور لوگ پہنتے ہیں۔

"ارے یہ مچھی مار کی چونچ ہے!"

"نہیں یہ بوڑھے دادا کی ہک والی چھڑی ہے۔ دیکھو نا۔ بالکل اسی طرح ہے۔"

"بالکل بچھو معلوم ہوتا ہے۔"

"چلو بھاگو، میاں، نہیں تو پٹوگے!"

"دھا۔ دھا۔ نیلی۔ تو مر جائے۔ ادھر مت جا۔ ادھر ماسٹر جی بیٹھے ہیں۔ ہش ہا۔ سوہنی۔ کمبخت کدھر جاتی ہے۔ یہ اسکول ہے..."

اور اس طرح ہنستے اور مذاق کرتے ہوئے چرواہے اور چرواہیاں ریوڑوں کو ہنکاتے ہوئے جنگل کو چلے جاتے۔ عبداللہ کڑھتا۔ مسکراتا۔ چیں بجبیں ہوتا۔ لیکن کیا کرتا۔ ابھی پچھلے سال اس نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اب بیوی بھی تھی۔ جب تک وہ میٹرک میں پڑھتا رہا اس کے سسر نے بکمال مہربانی بتول کو اپنے گھر پناہ دی تھی۔ لیکن اب اس کی بے فکری کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اسکول میں سب سے ذہین لڑکا تھا۔ لیکن آگے پڑھائی جاری رکھنے کے لیے صرف ذہانت کام نہیں دے سکتی تھی۔ کالج کی پڑھائی کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ بچہ

کفایت کے بعد بھی اس غریب کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کالج میں پڑھ سکے۔ ہار مان کر اُس نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت قبول کرلی تھی۔ اور قبول کرنے کا کیا سوال تھا۔ اُسے یہ ملازمت بھی بہت دشواریوں کے بعد ملی تھی۔ دس روپے تنخواہ تھی۔ اور دو فرد تھے۔ ایک عبداللہ دوسرے بتّول۔ کئی بار عبداللہ کو خیال آیا کہ اگر وہ اَن پڑھ کسان کا اَن پڑھ بیٹا ہی رہتا تو شاید اس کی زندگی بہتر ہوتی۔ لیکن تعلیم نے اُسے اب زندگی کی اُس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ جہاں سے وہ پیچھے ہٹنا نہ چاہتا تھا۔ یہ خودکشی ہوتی۔ بتّول اُسے بہت پیاری تھی۔ ایسی محبّت اُسے اپنے ماں باپ سے بھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن دس روپے میں وہ اُسے شال دوشالے نہ اُڑھا سکتا تھا۔ وہ کھدّر کے کپڑے جو وہ خود پہنتا تھا۔ اُسی کھدّر سے بتّول کی قمیضیں اور شلواریں بنتی تھیں۔ بتّول کو اُس نے خود تعلیم دی تھی۔ اور ہوشیار لڑکی بہت جلد اُردو، انگریزی، حساب اور جغرافیہ سیکھ گئی تھی۔ تواریخ اُسے پسند نہ تھی، بادشاہوں کے نام اور سمت یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ تعلیم نے عبداللہ کو اپنی موجودہ زندگی سے بےحد متنفر کر دیا تھا۔ اور اخباروں کے پڑھنے سے

اس کے خیالات خطرناک طور پر سیاسی ہو گئے تھے لیکن پیٹ بُری بلا ہے۔ اور اب اُس کی اُولوالعزمی، فطرتی ذہانت اور ترقی کی راہیں سب مسدود ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن بتول پڑھ کر زیادہ وفا شعار، خدمت گزار اور فراخ دل ہو گئی تھی۔ پہلے وہ زیوروں کے لیے تقاضہ کیا کرتی تھی۔ اب اُسے اپنے کانوں میں چاندی کی بالیاں بھی بُری معلوم ہوئیں۔ اور اُس نے اُنہیں اُتار دیا۔ ناک کی بڑی لونگ، چاندی کی اہیل، اور کلائیوں میں پڑے ہوئے چاندی کے کڑے سب اُتر گئے۔ شاید وہ سونے کے پتلے پتلے بانکے زیور پہن لیتی۔ لیکن سونا حاصل کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا الہ دین کا چراغ۔ اسی لیے تو اب اُس کے گدرائے ہوئے بازو ننگے تھے۔ اور ستواں ناک، رو پہلی نکیل کے بغیر۔ لیکن، بتول نے شیشے میں یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ زیور اُتار دینے سے اُس کی شکل نکل آئی ہے، اور اُس کی خوبصورتی پہلے سے دو چند ہو گئی ہے۔ ستاگرہ میں آنے کے چند دنوں کے بعد اُس نے عبداللہ کو صلاح دی کہ وہ خود ہر گاؤں کے نمبردار کے پاس جائے بلکہ

اگر ہو سکے تو ہر ایک کسان کے پاس جائے۔ اور اُس سے کہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل کرے۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ کسان اس کے اپنے بھائی تھے، ہم اور وہ کوئی دو تو نہیں۔ اور پھر اگر وہ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا اور چند دن اور اسکول کی یہی حالت رہی تو شاید ساگرہ کا پرائمری اسکول ہی بند کر دیا جائے۔ اور کسی طرح اور ماسٹر کو یہاں آنے کی ترغیب دی جائے۔ بہرصورت اس طرح چُپ چاپ بید کی کُرسی پر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔

عبداللہ دل میں بہت کڑھا۔ تعلیم کے فائدے اُس نے کتابوں میں اتنی بار پڑھے، کہ اُس کا یقین تھا کہ جُونہی اُس کا اسکول کھُلے گا۔ کسانوں کے لڑکے خود بخود بھاگتے چلے آئیں گے، اور اُن کے ماں باپ اُس کی منتیں خوشامدیں کر کے اُنہیں اسکول میں داخل کرائیں گے۔ لیکن یہاں معاملہ ہی برعکس تھا۔ یہاں ماسٹر جی کو کاسۂ گدائی لے کر گھُومنا پڑے گا کہ خدارا اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل کراؤ۔ فیس معاف ہو گی۔ جب چاہو چھٹی ملے گی۔ قاعدے مفت ملیں گے۔

لڑکوں کو پیٹا نہیں جائے گا۔ انعام اور وظیفے ملیں گے۔ خدارا اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کراؤ۔ نہیں تو ایک غریب ماسٹر کی روزی چھین جائے گی۔

دو چار روز گھومنے کے بعد عبداللہ کو پتہ چلا کہ اس میں کسانوں کا بہت قصور نہ تھا۔ صدیوں سے کسانوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ ان کا کام بیج بونا اور فصل کا کاٹنا اور مالک کی اطاعت کرنا اور لکھنا پڑھنا صرف چند ایک اشخاص کا کام تھا۔ اور جو کوئی دوسرا پڑھے یا پڑھنے کا ارادہ کرے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ یہ تو برہمن کسانوں کا حال تھا۔ اور مسلمان کسانوں میں بھی مولوی نے تعلیم کے معاملے میں اپنی خود غرض آمریت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ چند لڑکوں کو قرآن مجید کے ایک دو سپارے رٹا دیتا، اور بس باقی کام وہ نقش سلیمانی اور اسم اعظم کے تعویذ دے کر پورا کر دیتا تھا۔ اِن حالات میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے کسان کا دل اور ضمیر تعلیم سے خائف رہا۔ اور

اُسے بیج بیج بونے، فصل کاٹنے اور مالک کی اطاعت کرنے سے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ گرد و پیش کے حالات سے آگاہی حاصل کرسکتا۔ اور عبداللہ نے سوچا کہ وہ کسانوں کو گرد و پیش کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے اسباب پیدا کرکے غیر شعوری طور پر چند خطرناک نتائج کو قریب لانے کا ذمہ دار بن رہا تھا۔ یہ جان کر اُسے ایک گونہ خوشی ہوئی اور وہ اور بھی انہماک سے اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اور اُس نے کسانوں کو ترغیبیں دے دے کر اور سبز باغ دکھا کر بہت سے لڑکوں کو اپنے اسکول میں داخل کروالیا۔

ساگرہ میں جس لڑکے نے سب سے پہلے اسکول میں داخل ہونے کی استدعا کی وہ گلاب تھا۔ لیکن گلاب کو اسکول جانا کبھی نصیب نہ ہوا۔ ست نرائن نے محسوس کیا کہ گلاب کا اسکول میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کالے حرف پڑھ کر گلاب اپنی زمین اور دوکان کو واپس لینے کا تقاضہ کرسکتا تھا۔ اور پھر مویشی خانے کا کام کون سنبھالے گا۔ ریوڑ کون چرائے گا۔ دودھ کون دوہیگا، اور ایسے ایسے بہت سے کام جو

گلاب کرتا تھا، کون کرے گا۔ نہیں وہ گلاب کو اسکول میں نہیں بھیج سکتا تھا۔ ہاں اُس نے اپنے سب سے چھوٹے دو لڑکے اسکول میں بھیج دیے۔ گلاب کو بہت مایوسی ہوئی۔ اُس کا دل عبداللہ کو بید کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بیقرار ہوگیا تھا۔ کاش وہ بھی ایک اسکول ماسٹر بن سکتا۔ اور چار خانے والا اونی کوٹ پہن کر اِسی گاؤں کے سب لڑکوں کو پتلی بید کی چھڑی سے پیٹ سکتا۔ اُسے گاؤں سے دن بدن نفرت ہوتی جارہی تھی۔ یہ گاؤں جہاں وہ درگا سے محبت نہ کرسکتا تھا۔ یہ گاؤں جہاں اسکول میں داخل نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن یہی گاؤں اُس کی دُنیا تھی۔ اور صدیوں سے اس کی جڑیں اِسی زمین میں تھیں۔ اور وہ کہیں جا نہ سکتا تھا۔ باہر کی دُنیا سے وہ ناواقف تھا۔ اسی لیے باہر کی دُنیا اُسے ڈراؤنی، بھیانک اور خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ اسی لیے تو اُس کے قدم ابھی تک سخت نادائن کے مویشی خانے کے اندر رُکے ہوئے تھے۔

لیکن نفرت کے اُس پودے کو جو خود بخود حالات سازگار

ہونے کی وجہ سے اُس کے دل میں اُگ آیا تھا، بتول نے بڑی محبت اور محنت سے پالا۔ بتول نے کہیں سے گلاب کی رام کہانی سُن لی۔ اور جب عبد اللہ نے اُسے بتایا کہ کسی طرح ست نرائن گلاب کو اسکول میں داخل کرانے پر راضی نہیں ہوتا تھا، تو وہ خود گلاب کی تعلیم و تربیت پر تُل گئی۔

گلاب بھی بہت جلد اُس سے مانوس ہوگیا۔ گلاب کی عمر اُس وقت چودہ برس کی تھی۔ اور بتول اُس سے بمشکل چار پانچ سال بڑی ہوگی۔ لیکن بتول کی عقل اُس کی عمر سے کہیں بڑی تھی۔ بتول نے گلاب سے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں، اگر تم اسکول میں داخل نہیں ہوسکتے نہ سہی تم میرے پاس اُس وقت آجایا کرو جب تمھیں فرصت ملے۔ میں تمھیں خود پڑھاؤں گی۔"

اور بتول نے تین سال سچ مچ اُسے نہایت محنت اور شفقت سے پڑھایا۔ اور گلاب نے بتول کی شفقت میں ماں، بھائی اور بہن کی الفت کا پہلی اور آخری بار مزہ چکھا۔ وہ اُس سے بھائیوں کی طرح لڑتی۔ بڑی بہنوں کی طرح

بھڑکتی اور اکثر لمحوں میں اپنے سلوک سے اپنی دبی ہوئی فطری ماتا کی جھلک دکھا کر گلاب کے دل کو شاد کر دیتی تھی۔ بیشک اس محبت میں دُرگا کی محبّت کی سی جنسیت، گہرائی اور تڑپ نہ تھی اور نہ ہی حقیقی ماں کا سا انوکھا پیار، لیکن گلاب کے لیے جسے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہ تھی۔ اور جسے حسن و عشق کے آسمانوں میں اُڑتے دیکھ کر دُرگا نے اس کا رتیلا کنارہ دکھا دیا تھا۔ یہی محبّت بہت تھی۔ اسی محبت نے اُس کے دل میں ساری زندگی بھر انسانیت کا ایمان تازہ رکھا۔ اور وہ اکثر سوچتا کہ بقول رملاکین میں اُس کے جذبات کے خوفناک دھارے کا رُخ نہ پلٹ دیتی تو وہ بڑا ہو کر خونی اور ڈاکو کے سوا اور کچھ نہ بن سکتا۔ لیکن اِن تین سالوں کی صحبت میں اُس نے بہت کچھ سیکھ لیا۔ اول تو یہ کہ مسلمان بھی انسان ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ سب انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ ستگرہ کے گاؤں سے باہر جس کی طرف دو طرفیں ہیں، ایک اور دُنیا آباد ہے۔ جس کی چار طرفیں ہیں۔ شمال۔ مشرق۔ جنوب۔ مغرب۔

زمین گول ہے۔ اور ساگرہ کے لوگ گاؤں کے مینڈک ہیں۔ حاکم لوگ اس لیے حکومت کرتے ہیں کہ لوگ جاہل اور بے خبر ہوتے ہیں۔ علم زندگی کا زیور ہے۔ اور سرکار انگریزی کی برکتیں ہندوستان پر اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ نہ ہی تو وہ گنی جاسکتی ہیں اور نہ ہی ہندوستان کے لوگ کبھی اُن سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں ۔ گلاب ذہین تھا اور پڑھنے کا شوق رکھتا تھا اس لیے جلد ہی وہ یہ سب کچھ سیکھ گیا۔ اور اُن پر اپنا اعتقاد لے آیا۔

تین سال کے قلیل عرصے میں اُس نے پانچویں تک تعلیم حاصل کر لی ۔ اور جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو عبداللہ نے اُسے بھی امتحان میں شریک کر لیا۔ جہاں وہ سب لڑکوں میں اوّل رہا۔ بتول کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور ماسٹر عبداللہ نے بھی اُسے بہت شاباش دی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُسے دن بھر سکول کے کام سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ وہ گلاب کو تعلیم دے سکتا۔ پھر بھی اُسے بتول کی خاطر گلاب سے بہت ہمدردی تھی۔ مگر جب بھی اُس کے پاس کچھ وقت ہوتا اور گلاب حاضر ہوتا تو وہ

ضرور اُسے کام کی باتیں بتاتا۔ لیکن اس کے پاس وقت ہی بہت کم بچتا تھا۔ اوّل تو وہ ادیب فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ تاکہ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوسکے اور وہ کسی مڈل اسکول میں لگایا جائے۔ جہاں وہ بتول کے لیے سونے کے گہنے بنوا سکتا۔ پھر سکول کے لڑکے بہت شرارتی اور آوارہ مزاج تھے۔ وہ جم کر ایک جگہ کام نہ کر سکتے تھے۔ وہ جنگلوں میں آزاد پھرنا جانتے تھے۔ اور یہاں انہیں گھنٹوں گھٹنوں کے بل اُکڑوں ہو کر قاعدہ یاد کرنا پڑتا تھا۔ اُنہیں خوش رکھنے کے لیے عبداللہ کو اسکول میں بہت سی چھٹیاں دینی پڑتیں۔ یا اگر چھٹی نہ دیتا تو لڑکے یہ کہتے ہوئے

ڈھاکے بکّے آخرے
مسیتی کم نے
ملّا ہو، مَر ی گئے
مُلّانی سر کھے

اسکول سے رفو چکّر ہو جاتے اور سیٹیاں بجاتے گھاٹیوں کے

مرغ زاروں میں آخرے چُن چُن کر کھاتے۔ اِن چُھٹیوں کے علاوہ لڑکوں کے والدین علیٰحدہ چُھٹیاں تجویز کرتے۔

"ماسٹرجی آج میری لڑکی بیمار ہے ذرا ننھے کو چُھٹی دیدیجیے۔ ریوڑ کو جنگل میں لے جائے گا۔"

"ماسٹرجی دھان کی پنیری تیار ہے۔ لڑکوں کو چُھٹی دیدیجیے۔"

"ماسٹرجی گھاس پیلی ہوگئی ہے لڑکوں کی ضرورت ہے۔"

"لڑکوں کو چھٹی دیدیجیے۔"

اور عبداللہ کو چھٹیاں دینی پڑتیں۔ اور لڑکوں کے والدین بھی اُسے خوش کر دیتے تھے۔ مکھن، چاول، مکئی اور پھل، لکڑیاں، مرغی، انڈے ماسٹرجی کی نذر ہوتے رہتے۔ اور اگر کوئی لڑکا نذر نہ دیتا تو خود ہی مانگ لیتے۔ سرکار بیوقوف نہیں تھی، جو انہیں دس روپے ماہانہ تنخواہ دیتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ یہ لو دس روپے ماہانہ۔ ہمیں پتہ ہے کہ ان دس روپوں میں تمہارا کام نہیں چل سکتا۔

لیکن آخر یہ کسان لوگ کس مرض کی دوا ہیں۔ علم زندگی کا زیور ہے۔ اور جن لوگوں کو تم زندگی کا زیور عطا کرتے ہو کیا ان سے تمھیں یہ معمولی سی چیزیں مانگنے میں بھی شرم آتی ہے؟

لیکن عبدؔاللہ کو سچ مچ یہ چیزیں مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اور بتوؔل تو بہت کُڑھتی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے۔ تجربے نے اُنہیں سکھا دیا تھا کہ دس روپیوں میں گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اور موجودہ زندگی کے چلتے ہوئے تیز دھارے پر پیٹ اور ایمان دونوں ایک ہی وقت میں سلامت نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لیے تو وہ مکھّن اور چاول قبول کرنے لگے تھے۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا کہ گو علم زندگی کا زیور ہے۔ لیکن کسان۔ زندگی کا منبع ہے۔ اور یہ منبع ہر روز سوکھتا جا رہا تھا۔ گویا انسانیت اپنے ہاتھوں خودکشی کر رہی تھی۔ عبدؔاللہ نے سوچا کہ جب ادیب فاضل پاس کرے گا اور کسی مڈل اسکول میں، کسی اچھے مڈل اسکول میں۔ اچھے معاوضے پر تعینات ہو جائے گا۔ تو کبھی کسان سے نذر قبول نہ کرے گا۔

آخر بتول کی دُعائیں رنگ لائیں اور عبداللہ نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ جب وہ ادیب فاضل کا امتحان دینے کے لیے سری نگر روانہ ہوا، تو اُس نے گلاب سے بتول کی خبر گیری کے لیے کہا۔ اور گلاب نے ایسی جاں فشانی سے بتول کے کام کیے، کپڑے دھوئے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا۔ راتوں کو اسکول کے آنگن میں سویا۔ غرض کہ ست نرائن نمبردار کے کاموں سے ایسی غفلت شعاری کا ثبوت دیا کہ ست نرائن اور دیگر بوڑھے برہمنوں کو پورا یقین ہو گیا کہ اسکول ماسٹر نے گلاب کو مسلمان کر لیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی سلسلے میں ایک عرضی بنام سرکار داغ دی۔ کہ یہاں کا ماسٹر ہمارا دھرم گنوانے پر تُلا ہوا ہے۔ سرکاری محکمہ میں جب یہ عرضی گھومتی گھومتی آخری حاکم اعلیٰ کے پاس گئی تو اُس وقت عبداللہ ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اُسے ترقی دے کر ایک مڈل اسکول میں تعینات کیا گیا۔ ساگرہ کے گاؤں سے اُس کی تبدیلی ہو گئی اور اس طرح گاؤں والوں کے آنسو بھی پونچھ دیے گئے۔

بتول کے چلے جانے کے بعد گلاب، چند دن ہی ساگرہ میں رہا۔ اب اُس کا دل ساگرہ کے کنویں سے گھبرا گیا تھا۔ وہ صدیوں کی جڑیں اُکھڑ چکی تھیں۔ چلتے وقت بتول نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے رُخساروں سے آنسو پونچھے تھے، اور آنسو پونچھتے پونچھتے خود بھی رو پڑی تھی۔ عبداللہ نے گلاب کو سری نگر میں ایک ہیڈ ماسٹر کے نام چھٹی دی تھی اور کہا تھا کہ اگر وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہے گا تو وہ ہیڈ ماسٹر اُسے دسویں تک تعلیم دلانے میں بہت مدد دے گا۔

چنانچہ ایک دن ست نرائن نمبردار نے گلاب کو غائب پایا۔ مویشی خانے میں ڈنگر چلّا رہے تھے۔ دن چڑھے تک اُنہیں کسی نے نہ کھولا تھا۔ نہ پانی پلایا تھا۔ نمبردار نے دیکھا کہ گلاب کی چارپائی خالی ہے۔ چارپائی پر اُس کا پھٹا ہوا کمبل پڑا تھا۔ اور گلاب کی بنسری، اور کاغذ کے ایک ورق پر، لکھا تھا۔ "میں جا رہا ہوں۔ پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میری بنسری درگا کو دے دی

جائے۔ گلاب رائے"

درگا کے باپ نے بنسری کو ایک چٹان پر ریزہ ریزہ کرتے ہوئے کہا۔ "حرامی، میری معصوم بیٹی کو ورغلانا چاہتا تھا"

اور ست نرائن نمبردار نے شام کو شیو جی کے گرد پر کرما لیتے ہوئے پرماتما کا شکر ادا کیا۔ جس نے آج اس کی دولت میں معتد بہ اضافہ کر دیا تھا۔

گلاب کو ساگرہ سے سری نگر پہنچنے میں قریباً ایک مہینہ لگ گیا، اول تو اُسے راستہ ہی معلوم نہ تھا۔ اور پھر اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ کہ وہ راستے میں دیگر مسافروں کی طرح سامانِ خورد ونوش خرید سکتا، اس کے پاس ایک ہی قمیض تھی اور ایک ادنیٰ فرغل، پاؤں میں دھان کی پولین، اور ہاتھ میں کاؤ کی ایک ٹیڑھی اور مضبوط لکڑی، لیکن دل میں عزم راسخ تھا اور وہ اپنی زندگی کی شکست کو فتح میں مبدّل کرنا چاہتا تھا، پانچویں جماعت میں اوّل رہنے پر اس کی انانیّت

چمک اٹھی تھی۔ سویا ہوا شخصی غرور بیدار ہوگیا تھا۔ اور اُس کے سامنے عبداللہ کی مثال تھی۔ جو اُس کی طرح ایک کسان کا بیٹا تھا۔ اور جس نے پہلے دسویں اور اب ادیب فاضل بھی پاس کرلیا تھا۔ پہلے دن اس نے وہی مکئی کی باسی روٹی اور کرم کا ساگ کھایا جو وہ ساگرہ سے لایا تھا۔ اور دوسرے دن جب راہ چلتے چلتے اُسے بہت بھوک لگی، تو وہ راستہ سے اُتر کر ایک گاؤں میں اُتر گیا، راستے میں اُسے ہر ایک گاؤں ساگرہ کی طرح نظر آتا تھا۔ اتنا فرق ضرور تھا کہ وادی کہیں کشادہ ہوتی تھی اور کہیں تنگ، لوگوں کے لباس بھی ایک ہی طرح کے تھے اور طرزِ گفتگو بھی وہی، لیکن یہ سب گاؤں مسلمانوں کے تھے۔ کہیں اکّا دکّا اُسے برہمنوں کا گاؤں مل جاتا۔ یا کسی مہاجن کا گھر۔ پہلے تو اُس نے مسلمانوں کے گھروں سے روٹی مانگنے سے احتراز کیا، اور اکثر کسان لوگ اُسے خود ہی کسی اکّے دُکّے برہمن یا سکھ یا مہاجن کا گھر بتا دیتے تھے۔ اکثر گاؤں میں ایک آدھ

مہاجن ضرور ہوتا تھا۔ اُس کا گھر باقی گھروں سے ہمیشہ کشادہ اور صاف ہوتا۔ یہ مہاجن عموماً علاقہ پوٹھوہار پنجاب سے آئے ہوئے ہوتے، ان کا گاؤں میں رعب تھا۔ کسان انہیں شاہ جی کہہ کر پکارتے تھے، اور وہ سچ مچ گاؤں کا شاہ بلکہ بادشاہ تھا۔ پٹواری اور فارسٹ کے راکھے اور فارسٹروں کی آنکھیں بھی اُس کے آگے جھکتی تھیں۔ گاؤں کے نمبردار سے لے کر گاؤں کے کمین تک ہر ایک شخص اس کا قرض دار اور احسان مند تھا، مہاجن گاؤں کا امدادی بنک تھا۔ مہاجن گاؤں کا بزاز تھا، مہاجن گاؤں کا حکیم تھا، اور مہاجن گاؤں کا بنیا، اور اکثر اوقات پنچ بھی۔ کسان لوگوں کا بال بال اس کے قابو میں تھا، اور پھر بھی کسان لوگوں کے بال بال سے اس کے لیے دعائیں نکلتی تھیں۔ اور وہ یہ حقیقت میں سمجھتے تھے کہ اگر گاؤں میں شاہ نہ ہو تو وہ بھوکے مر جائیں۔ پٹواری اور تحصیلدار کے بغیر گذارہ ہو سکتا تھا۔ لیکن شاہ کے بغیر نہیں۔ تحصیلدار مشیر مال،

محاصلات کا افسر، اور جنگلات کا بڑا بابو ہر ایک سرکاری کارندہ شاہ کی اہمیّت کو سمجھتا تھا۔ اور یہ تو ایک باہمی سمجھوتے کی بات تھی، کہ جب سرکاری کارندے گاؤں میں سرکاری کام پر آتے تو ہمیشہ شاہ جی کے مکان پر ٹھہرتے، اور شاہ جی اُن کی خوب خاطر تواضع کرتے۔ اور جب شاہ جی اپنے ملاقات کے سلسلے میں تحصیلدار یا نائب تحصیلدار کی عدالت میں جاتے، تو کچہری کا ہر فرد اُن سے ادب و احترام سے پیش آتا۔ انہیں بید کی کرسی پر بٹھایا جاتا، عمدہ سگریٹ پیش کیا جاتا، اور شاہ جی دبی زبان سے کہتے۔ "دیکھنا منشی جی۔ تاریخ ذرا نزدیک رکھنا، اگلی پیشی کی تاریخ کہیں دُور نہ رکھ دینا۔ مقدمے کا جلد فیصلہ ہو جائے۔" اور منشی مسکرا کر کہتا۔ "بھلا شاہ جی کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بات رد کر دی جائے۔ آپ کونسی تاریخ چاہتے ہیں؟ اگلے مہینے کی پندرہ؟ اچھی بات ہی ہی۔ ایک ہفتہ اِدھر کیا، ایک ہفتہ اُدھر کیا، ایک ہی بات تو ہے۔" اور تحصیلدار صاحب کہتے۔ "ہاں ہاں، بھا دول ہی ٹھیک ہے۔ اس وقت

ہم بھی دورے سے واپس آئے ہوں گے۔

لیکن گلاب نے معلوم کیا کہ اکثر شاہ بہت مہمان نواز تھے۔ اور براہمنوں پر تو وہ اکثر بہت مہربانی کرتے تھے۔ اور جب اُنہیں پتہ چل جاتا کہ گلاب برہمن ہے اور تحصیل علم کے لیے شری نگر جا رہا ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوتے، اُسے اچھی روٹی کھلاتے، اور چلتے وقت ایک دونی بھی برہمن دیوتا کی نذر کر دیتے۔ موضع نکا کے شاہ جی اس کی اُولوالعزمی پر بہت محظوظ ہوئے، کہنے لگے "شاباش، بیٹا شاباش، میں تمہاری جرأت پر بہت خوش ہوں۔ میں بھی ایک دن تمہاری طرح گھر سے نکل بھاگا تھا۔ ہم چکوال میں رہتے تھے۔ میرے ماں باپ بہت غریب تھے۔ اور میرا باپ گدھوں پر اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتا تھا۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے۔ پھر ایک دن میں لڑ کر گھر سے بھاگ آیا، اور یہاں چلا آیا۔ بہت دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا، اور آخر ایک ساہوکار نے مجھے بتایا کہ موضع نکا بیوپار کے لیے بہت اچھی جگہ ہوگئی، وہاں ابھی تک

شاہ نہیں بیٹھا، اس نے مجھے ایک نسوار کا ٹین اور نمک
چند ایک اور ضروری اشیاء اُدھار دیں۔ نمبردار نے
کان مجھے عاریتاً دی۔ اور آج دیکھو کہ اپنی محنت و
ت کے بعد میں اس گاؤں کا شاہ ہوں۔ آس پاس
علاقے میں میرا بنج و بیوپار پھیلا ہوا ہے۔ کم و بیش
ں پچاس ہزار میں نے باہر ڈیوڑھے پر دے رکھا ہے۔
ہ میری عزت ہے۔ شادی بھی میں نے کی ہے۔ تین بچّے
۔ اب میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ یہ میرا بڑا لڑکا موتی رام
ری عمر کا ہوگا۔ یہی اب دُکان کا کام چلاتا ہے۔ اب
نا ہوں کہ باقی دو لڑکے بھی بڑے ہو جائیں تو انہیں بھی
قے میں بنج و بیوپار پر لگا دوں۔ تو میرے کہنے کا مطلب
ہ کہ بیٹا اُولعزمی بڑی چیز ہے۔ اگر آج میں چکوال میں
رہتا تو گدھے لادتا، جنگلوں کی خاک چھانتا۔ شاید
کسی درندے کا شکار ہو جاتا۔ اب تو میرے پاس لائسنس
ہے۔ اے موتی رام بیٹا! میں ذرا پٹواری کے گھر ہو آؤں۔
بر ہمن دیوتا کا خیال رکھنا، اور انہیں کوئی تکلیف

نہ ہونے دینا۔ بھوجن وغیرہ اچھی طرح سے کھلانا۔ اچھا رام رام بھیّا۔ خُوب پڑھو، کبھی اس علاقے میں تحصیلدار بن کر آؤ، تو اس غریب شاہ کو بھی یاد رکھنا۔"

گلاب غور سے موتی رام کی طرف دیکھنے لگا، شاہ کا لڑکا چالیس پچاس ہزار کا مالک، یہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔ موتی رام دُبلا سا لڑکا تھا۔ بس اس کا ہم عمر ہو گا۔ یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال، رُخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں۔ لیکن رُخساروں پر سُرخی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمکتی ہوئیں۔ ہونٹ موٹے اور نمناک، یہ لڑکا، چالیس پچاس ہزار روپے کا مالک۔ رام رے، اتنے روپے، اُس نے آج تک کبھی ایک روپیہ بھی کہیں سے نہ پایا تھا۔ یہ بنج و بیوپار بھی خوب چیز تھی۔ اور عبداللہ کی زندگی سے کس قدر مختلف اور ارفع۔ عبداللہ کا کارنامہ اُسے بالکل ہیچ معلوم ہونے لگا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دُکان پر ایک نوجوان عورت آئی، موتی رام اُسے دیکھتے ہی مُسکرانے لگا۔

"سلام چھوٹے شاہ جی!"

"سلام، نورنشیاں، بڑی مدت کے بعد آئی ہو، شادی
بھی تمھاری، مبارک ہو۔"
"تمھیں مبارک ہو چھوٹے شاہ جی۔" نورنشیاں نے شرماکر
کہا۔ اور اس کے رخسار گلابی ہوگئے۔ نورنشیاں نے رنگین اور
پھولدار سوسی کی بھاری شلوار پہن رکھی تھی۔ اور اسی کپڑے
کی قمیض بھی۔ سر پر سرخ چادر تھی۔ اور چوٹی کے آخر میں
نقلی موتیوں کی سبز سبز لڑیاں گندھی ہوئی تھیں۔ جو اس کے
کندھوں یا گردن کی ایک خفیف سی حرکت سے وجد میں
آجاتی تھیں۔ اور ایک رو پہلا نغمہ پیدا کردیتی تھیں۔ اس کے
ہاتھوں میں چاندی کے چھلے تھے۔ اور ایک گلٹ کی سنہری
انگوٹھی۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ناک میں سنہری لونگ۔
گو اس کا قد موتی رام سے بھی لمبا تھا، لیکن اب وہ وہاں کی
چوکھٹ کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑی تھی، کہ بالکل ایک
کھلونا سا معلوم ہوتی تھی۔ موتی رام اسے گرسنہ نگاہوں سے
دیکھ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تارے کی طرح
چمکنے لگیں۔ اور اس کے موٹے ہونٹ لعاب سے گیلے ہوگئے

وہ کچھ کہنے کو تھا۔ لیکن گلاب کو پرے بیٹھا دیکھ کر رک گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا "اور...... تمہاری سہیلی سیداں کہاں ہے۔ کیا اس کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ مدت سے اُسے نہیں دیکھا۔ اس مہینہ تو وہ دکان پر نہیں آئی۔ کیا ہم سے کوئی خفگی ہے؟"

نورنشیاں زیرِ لب ہنسی، پھر بولی۔ "نہیں، چھوٹے شاہ جی وہ اپنی خالہ کے ہاں گئی ہے"

موتی رام نے کہا "تمہاری شادی بھی ہو گئی اور تم نے ہمارا منہ میٹھا بھی نہ کرایا۔ اکبرا کہاں ہے؟"

"وہ پار (پنجاب) گئے ہیں، خالو کے لڑکے کا خط آیا تھا کہ کسی جی۔ باورچی خانے میں ایک جگہ خالی ہونے والی ہے"

"اچھا۔ اچھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے"

نورنشیاں قدرے توقف کے بعد بولی۔ "مجھے تھوڑا سا گُڑ چاہیے اور چھوارے"

موتی رام نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ نورنشیاں کے کندھے پر رکھ دیا۔ آہستہ سے۔ اور بظاہر بالکل لاپروائی سے۔

نورنشیاں پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح جُھک گئی۔ بولا۔ "خوب، گُڑ اور چھوارے بھی ہم ہی دیں۔ اور تمھاری شادی ہوئی تم نے ہمارا مُنہ میٹھا بھی نہ کرایا۔ کیوں جی؟"

نورنشیاں نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا "میں کیسے مُنہ میٹھا کراؤں؟"

موتی رام نے اس کے کندھے سے ہاتھ اُٹھا لیا اور آہستہ سے بولا۔ "اچھا، جو چاہیے لے لو، اس طرف اندر آجاؤ۔ اور اپنی پسند کی چیز لے لو۔ ادھر سب اچھی چیزیں پڑی ہیں، نیا پشاوری گُڑ آیا ہے۔ شہد کی طرح میٹھا، تازے چھوارے اور دودھ کی طرح سفید ناریل اور سونف کے مکھانے، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مکھانے، آؤ۔"

دیر تک نورنشیاں چوکھٹ سے لگی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ موتی رام نے اپنی کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے اُس کے بازو کو پکڑ لیا۔ اور اُسے کھینچ کر دُکان کے اندر ایک گدام کی طرف لے جانے لگا۔ سبز سبز نقلی موتیوں کی لڑیوں سے ایک جھنکار سی پیدا ہوئی۔ اور گلاب کو معلوم

ہوا جیسے وہ کوئی نوحہ پڑھ رہی ہو ۔ اور اس کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا۔

بہت دیر کے بعد نورشبّاں دُکان سے باہر آئی، اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ گال تمتمائے ہوئے۔ اور سُرخ چادر کی جھولی میں چھوارے اور ناریل اور مکھانے بھرے ہوئے تھے۔

ایک سوئیلی تصویر

جس کی ابھی تک کوئی ابتدا ہے نہ انتہا

اور

جو ہر وقت آنکھوں کے آگے

ناچتی رہتی ہے

اس دن میں بہت اُداس تھا، کیوں کہ میں نے ایک کتاب میں اُسی روز جرمنوں کے اُن وحشیانہ مظالم کا حال پڑھا تھا، جو اُنھوں نے یوکرین کے معصوم بچّوں پر روا رکھے۔ یوں تو ہر آدمی موت کے سامنے معصوم ہوتا ہے، اور زندگی کی آخری حد پر اُس کی حیثیت ایک ننھے سے بچّے سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ میں نے بڑے بڑے مجرموں اور پھانسی پر لٹکنے والے قاتلوں کو موت کی تاریک سُرنگ کی دہلیز پر ایک بچّے کی طرح مغموم و پریشان دیکھا ہے۔ منہ میں اُنگلی ڈالے ہوئے

جیسے انھوں نے کبھی کوئی جرم ہی نہ کیا ہو، جیسے اُن کی نگاہوں میں اب بھی وہی حیرت و استعجاب باقی ہے، جس سے انھوں نے اپنی زندگی کے پہلے روز دُنیا کو دیکھا تھا۔

لیکن بچّوں کا معاملہ اور ہے۔ اگر عادی مجرم موت کے سامنے اس قدر معصوم ہو سکتے ہیں، تو اس نوزائیدہ کلی کی لطافت کا کیا کہنا جو ابھی موت اور زیست میں امتیاز ہی نہیں کر سکتی، جس کی دُنیا ابھی گناہ اور سزا اور قتل اور خون کے تصور سے ملوث ہی نہیں ہوئی، اس لطافت کو کچلنے کے لیے کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایسی طاقت جس میں انسانیت کی ایک رمق بھی باقی نہ ہو، ایسی قوت جو انسان کے سینے سے نہیں، کسی ذی حس کے سینے سے نہیں، بلکہ اک سنگلاخ چٹان کی چھاتی سے پھوٹ کر نکلتی ہے، یہ وحشی، بربری قوت انسان کی دُنیا میں کیسے آگئی، اُس دن، اُس وقت کتاب اُلٹ کر میں یہی سوچ رہا تھا، سالہا سال، صدہا برس، پیچھے زمانے کے کہنہ اور شکستہ زینے پر میرا ذہن دوڑتا گیا، ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کے اوراق الٹتا گیا،

UNIVERSITY LIBRARY

یہ شقاوت نئی نہ تھی، کبھی اس کا نام جرمنی تھا۔ تو کبھی روسی، کبھی انگریزی تو کبھی امریکن، کبھی ہندی، کبھی ایرانی، لیکن تھا یہ ہی جذبہ، جو انسان کے سینے سے نہیں چٹان کی چھاتی کو چیر کر نکلا ہے۔ لیکن آدمیوں کی بستی میں اس کا کیا کام، قرن ہا قرن سے یہ یہاں کیا کر رہا ہے، میں نے، تم نے، اور اُسے، جسے سب لوگ تاریخ کہتے ہیں، اُسے اپنے ہاں کیوں جگہ دے رکھی ہے؟

یہی سوچ کر میں اُداس تھا، اور کتاب میں نے اُلٹ کر تپائی پر رکھ دی، اور اپنی بچی کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ جو میری گود میں لیٹی ہوئی ایک چھوٹی سی کٹوری سے آلوؤں کا بھرتا نکال کر کھا رہی تھی، مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی، اُس کی ننھی ننھی اُنگلیوں سے بھرتا لگا ہوا تھا، اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا۔ "تاؤ"

میں نے کہا۔ "نہیں! تم تاؤ"

نہیں! تم۔ اُس نے اصرار کیا۔ اور اپنی انگلیاں میرے منہ میں ڈال دیں اور پھر وہ میری زبان ٹٹولنے لگی۔ بولی "تاؤ"

آلوؤں کا بُھرتا کوئی بُری چیز نہیں، بچّی کا اپنے باپ سے پیار کرنا بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ اتنی معمولی کہ اس سے کسی کہانی سننے والے کو کوئی لطف نہیں آ سکتا، مجھے بھی اس وقت کوئی لطف نہیں آ رہا تھا، وہی بے کیف اُداسی طاری تھی، اب بھی یاد کرتا ہوں تو وہی بدمزگی تازہ ہو جاتی ہے، آلوؤں کا بُھرتا کونین کی طرح کڑوا تھا، کیونکہ یوکرین میں بچّوں پر گولی چلائی گئی تھی، ہاتھوں سے ان کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں، اور ان کی لاشوں کو ننگا کرکے برف پر پھینک دیا گیا تھا۔ اور یہاں یہ میری بچّی مجھ سے کہہ رہی تھی، "تاؤ"، مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا، آلو کے بُھرتے کا؟ کانسی کی کٹوری کا؟ یا اس کی محبّت بھری نگاہوں کا؟

جس جرمن نے گولی چلائی تھی، جس آدمی نے پہلی بار گولی چلائی تھی، جو آج بھی سنگین سے اپنے بچّوں کو تہ تیغ کر رہا تھا، اُسے اس محبّت بھری نگاہ نے، اسی آلو کے بُھرتے، اس کانسی کی کٹوری نے جنم دیا تھا، پھر وہ معصومیّت اور

محبت، کیوں کر فنا ہو گئی ؟ کیوں کر، کیوں کر ؟ میرے خدا!
میں نے بچی کو صوفے پر لٹا دیا اور گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ میں ابھی دروازے پر تھا۔ کہ بچی نے پکارا میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے ایک میں کانسی کی کٹوری اور دوسرے میں آلو کا بھرتا لیے کہہ رہی تھی "تاؤ" بے وقوف کچھ سمجھتی نہیں، خود جنم لے کر جنم دیتی ہے، دمی کی ماں بن کر چٹان کی تخلیق کرتی ہے، اب کوئی تجھ سے کیا کہے! "تاؤ" آج آلو کا بھرتا کھلا رہی ہے۔ کل کو لی چلوائیگی۔ میں نہیں کچھ کھاتا واتا!
میں جب اداس ہوتا ہوں، تو ہمیشہ "غریب گھر" کے سامنے سے گزرتا ہوں، اور شاید کوئی دن ہی ایسا گزرتا ہو کہ اس "غریب گھر" کے سامنے سے گزروں، پتہ نہیں۔ لوگ سے "غریب گھر" کیوں کہتے ہیں، پھول گیٹ کے باہر پتھر پل اس پار یہ غریب گھر واقع ہے، اس کے سامنے مٹیالی انیں ہیں، جن میں جوتے بنانے والے چمار، سائیکل گراموفون سنگر مشین درست کرنے والے لوہار، عرضیاں مثلیں اور

دستاویزیں ٹائیپ کرنے والے فن کار کام کرتے ہیں، نکڑ پر پتھر پُل کے قریب ایک ایرانی ہوٹل ہے، جہاں چائے کے گندے پیالوں میں غیر ملمع شدہ چمچے کھڑکھڑاتے ہیں، اور بھورے رنگ کے سیّال میں سے پُرانے گڑ کی ہمیک آتی ہے، ہوٹل کے باہر ہمیشہ گوشت جلنے کی بُو آتی ہے، یہاں لوگ کھڑے ہوکر کباب کھاتے ہیں، اور کباب کھاکر سگریٹ اور پان سے لطف اُٹھاتے ہیں، دو چار پنشن یافتہ بیرے پُل پر بیٹھے رہتے ہیں، اور اپنے انگریز مالکوں کی محیر العقول داستانوں کو ماضی کے کھنڈروں سے کھود کھود کر بیان کرتے رہتے ہیں، دو کوڑھی ایک مرد ایک عورت ہمیشہ قریب بیٹھتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے راہ گیروں کی طرف اسی انداز سے دیکھتے ہیں۔ گویا وہ اُن کی تنہائی میں مُخل ہوئے ہوں، کبھی کبھی عورت کوڑھی کے سر پر سے جوئیں چُننے میں مصروف ہوتی ہے پُل کی محراب کے نیچے دھوبی کپڑوں کو پتھروں پر کوٹتے نظر آتے ہیں۔ اور چھو ا چھو کرتے ہوئے اپنی کمر کھجاتے

لگتے ہیں، کبھی کبھی وہ اپنا ہاتھ روک کر نالے کے قریب نیم کے پیڑ سے لگے ہوئے جھولے کی طرف دیکھتے ہیں جہاں اُن کی لڑکیاں اور بہوئیں جھولا جھول رہی ہوتی ہیں، اور ننھے بچے گو پھالیے عقبی دیواروں پر چڑیوں کو نشانہ بنانے کی فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں، چھوٹے چھوٹے دروازوں والے گھروں کے پنجروں میں سے زرد رو عورتیں جھانکتی ہیں۔ بھوری عورتیں جنھوں نے اک عجیب سا گون پہن رکھا ہوتا ہے، لمبی ناک والے پارسی لڑکے اپنے پچکے ہوئے گالوں میں کریہہ دانت چھپائے رنگ دار بیلون اُڑاتے دکھائی دیتے ہیں، پارسی لوگوں کے گھروں کے باہر دہلیز پر اور دہلیز کے باہر فرش پر کھڑیا مٹی یا چاک سے پھول پتیاں بنی ہوتی ہیں، یہ ہر پارسی گھر کا امتیازی نشان ہیں۔ اس سبز رنگ کے گھر کے باہر جس کی دیواریں چھوٹی چھوٹی ہیں اور جس کی جھکی ہوئی بھوری چھت پر سے بجلی کے کھمبے کے تار گزرتے ہیں۔ مجھے ہر شام کو جب میں اس سمت رُخ کرتا ہوں، وہ لڑکی دکھائی دیتی ہے، سپید ریشمی ساری میں ملبوس

سپید سینڈل پہنے وہ پارسی لڑکی یہاں کھڑی ہوئی ہے جس کی تبسم کناں آنکھیں مجھے اس قدر پسند ہیں، وہ یہاں اکثر کھڑی ہوتی ہے، اُس وقت جب میں یہاں سے گزرتا ہوں یہ بھی اپنا بہترین لباس پہنے اپنے امریکن محبوب کی آمد کی منتظر ہوتی ہے، میں اس طرح آتا ہوں گویا میں ہی اس کا محبوب ہوں۔ یہ میری طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے عمر بھر اس امر کا کوئی امکان نہیں، کیوں نہیں ؟ میں اسے پسند کرتا ہوں یہ مجھے پسند کیوں نہیں کرتی، کیوں نہیں ؟ میں اور امریکن سپاہی دونوں اس کے محبوب کیوں نہیں ہوجاتے ؟ یا ای با کی طرح یہ لڑکی بھی ایک سے دو کیوں نہیں ہوجاتی، فی الفور ؟ اور کیوں جب یہ ایک سے دو ہوتی ہے کوکھ کی ابہرامی تاریکی میں نو مہینے تک ایک بیج کی پرورش کرتی ہے اور جب اپنا بدل پیش کرتی ہے تو خود ریشم کے پتنگے کی طرح مرجھا چکی ہوتی ہے اور راہ گیر، مسافر، اُسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے والا تماشائی گزر چکا ہوتا ہے !

پتھر کے پُل کے اُس پار غریب گھر ہے۔ "غریب گھر" میں

دو رویہ بارکیں بنی ہوئی ہیں۔ ان بارکوں کا رنگ سیاہ ہے، ان بارکوں کو ایک پارسی لکھ پتی بومن جی گوڈن والا نے تعمیر کرایا تھا۔ "غریب گھر"، کیا لکھ پتی ہمیشہ غریب گھر ہی تعمیر کرا سکتے ہیں، کیا بینکر صرف جنگ کرا سکتے ہیں؟ کیا ایسی دولت سچ مچ زندگی چوس لیتی ہے، اور سیاہ رنگ کی بارکیں تعمیر کرتی رہتی ہے۔ اس غریب گھر کے دروازے پر لوہے کا کٹہرہ ہے اور لوہے کے کٹہرے کے باہر بازار ہے، دکانیں ہیں اور تنگ دروازوں والے گھر ہیں جن میں زرد رو عورتیں ہمیشہ جھانکتی رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لوہے کے کٹہرے کے دونوں طرف "غریب گھر" ہے، ایک غریب گھر تو بومن جی گوڈن والا نے تعمیر کرایا ہے۔ یہ دوسرا غریب گھر کس نے بنایا ہے، بس کہانی سننے آتے ہو۔ جواب نہیں دے سکتے۔ گونگے ہو۔ بہرے ہو۔ اندھے ہو۔ اُس غریب گھر کو دیکھتے ہو۔ اس غریب گھر کو نہیں دیکھتے جو تمہارے اِردگرد ہر جگہ حتیٰ کہ تمہارے اندر بھی موجود ہے۔ میں پگلا ہوں؟ ہا ہا ہا، میرے اللہ اس سے بہتر مذاق تجھے کبھی سوجھا نہ ہوگا۔

لیکن نہیں، میں اب کچھ نہیں کہوں گا اور سیدھا اُس لوہے کے کٹہرے کے پاس پہنچ جاؤں گا، جو غریب گھر کے باہر بازار کی سڑک کو اس سے جُدا کرتا ہے۔ یہاں میں اُس وقت پہنچتا ہوں جب میرا جی بہت اُداس ہوتا ہے، یہاں غم غلط کرنے کے لیے ایک دوست غم گسار ہستی موجود ہے، یہ ہستی غریب گھر کے اندر نہیں، غریب گھر کے باہر رہتی ہے یعنی اُس لوہے کے کٹہرے اور بازار کی سڑک کے درمیان زمین کے اُس ٹکڑے پر جو دونوں غریب گھروں کو ایک دُوسرے سے جُدا کرتا ہے!

یہ ہستی یہاں کیوں رہتی تھی، اس لیے کہ وہ نادار تھی، وہ اس قدر غریب تھی کہ غریب گھر کی بارکیں بھی اُسے پناہ دینے سے عاجز تھیں، اس کی ٹانگیں نہ تھیں، صرف دو بازو اور اک سوکھا ہوا جسم، جس پر سوکھے سوکھے پستان مُردہ چوہوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے، چہرے پر لاکھوں جھریاں، چہرہ بھی سیاہ اور آنکھیں بھی سیاہ اور دانت غائب اور سر کے بال سفید، نہیں بالکل سفید نہیں یہ زردی مائل سپید

رنگ کے بال تھے۔ سیدھے اُوپر کو اُٹھے ہوئے، ان میں کبھی کنگھی نہ ہوتی تھی، نہ ہوتی ہوگی، اس کا چہرہ عورت کا سا تھا، لیکن اس کا سر آئین اسٹائین کا سا، یعنی اگر آئین اسٹائین اپنے سفید بالوں میں کبھی کنگھی نہ کرتا تو، اور کسی غریب گھر کے آہنی کٹہرے کے باہر آکر بیٹھتا تو وہ آئین اسٹائین نہ ہوتا، زرد دی مائیل سپید رنگ کے اُلجھے بالوں والی بے دھڑ کی بڑھیا ہوتا!

یہ جسم استخواں میرا دوست تھا، وہ عورت جس کا دھڑ نہ تھا، وہ سر جو آئین اسٹائین کا تھا، وہ آنکھیں جو کسی کی نہ تھیں۔ کم از کم میں نے تو ایسی آنکھیں کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھیں۔ یہ مت پوچھو کیا تھا اُن آنکھوں میں، یہ پوچھو کیا نہ تھا اُن آنکھوں میں، کائنات کی ساری خوبصورتی اور ہولناکی اُن آنکھوں میں سمٹ کر اُتر آئی تھی۔ نجانے کیسے، وہ ہم راز، غم گسار آنکھیں، سب کچھ سمجھ کر معصوم رہنے والی آنکھیں، جیسے اُنھوں نے موت اور زیست کا بھُرتا بنایا تھا اور اب مجھ سے کہہ رہی تھیں "کھاؤ"، غریب گھر کے باہر دہلیز پر سونے والی روح بھی اس قدر معصوم ہو سکتی ہے۔ سمجھ میں

نہ آتا تھا، شاید اسی لیے دونوں دنیاؤں نے اُسے دھتکار دیا تھا۔ اُس آہنی کٹہرے کے دونوں طرف جو دُنیائیں تھیں وہ ان میں سے کسی کی مخلوق نہ تھی، بلکہ ان دونوں کے بیچ میں آہنی کٹہرے سے لگی ہوئی، سمٹی سمٹائی، دو گز زمین پر گھسٹتی ہوئی وہ اپنے پرشکن چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیے الگ بیٹھی تھی اور دونوں دنیاؤں کا تماشہ دیکھتی تھی، میں نے اُسے کبھی بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ کئی بار میں اس کے سامنے سے گزر گیا۔ اُس کی کی طرف ترچھی انداز میں گھورتا ہوا گزر گیا۔ لیکن اس نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلائے، دونوں دنیاؤں کی دھتکاری ہوئی کتیا اس قدر مغرور کیوں تھی۔ کیوں، کیوں، میرے خدا!

ایک روز میں نے اُسے ایک آنہ دیا۔ اُس نے چپکے سے اپنے کشکول میں سے اُٹھا کر سامنے حلوائی کے لونڈے کو آواز دی،

"اے گڈو! بٹی کے لیے گلاب جامن دے جائیو"

یہ ٹھا ٹھ ہیں

دوسرے روز میں اُسے پھر ایک آنہ دیا۔

اے گڈو! لعل کے لیے امرتی لے آئیو۔

تیسرے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا۔
اے گڈو! شیریں کے لیے لڈو لے آئیو۔
چوتھے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا۔
اے گڈو! ہولی کے لیے تھوڑی سی ملائی لے آئیو۔

بٹی، لعل، شیریں اور ہولی، چار بچے تھے۔ آدمی کے نہیں بلّی کے، بلّی کا نام گُل تھا، وہ ایک سیاہ و سپید رنگ کا پھول تھی جس کی ہتھیلیوں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ یہ بلّی اُس کے سامنے پڑی رہتی ایک نواب زادی کی طرح مست کاہل اور ٹھوس اور بلّی کے بچے اُس بڑھیا کے چاروں طرف کھیل رہے ہوتے۔ اور اُس کے سوکھے پستانوں سے اُچھل کر اُس کی ناک پر سے کودتے ہوئے اُس کے سپید گھنے بالوں کے جنگل میں کھیلنے لگتے، ان میں بٹی خاص طور پر بڑی شریر تھی اور بڑھیا کی پیاری تھی۔ میں نے اکثر اُسے اُس کے سر پر ہی دیکھا تھا۔

بڈھا کو گلاب جامن بہت پسند تھے۔

اور تم کیا کھاتی ہو۔ جب ہم دوست بن گئے تو میں نے اُس سے پوچھنے کی جرأت کی۔

وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں اِدھر کا۔ اُدھر کا دونوں طرف کا کوڑا کرکٹ کھاتی ہوں۔

تم غریب گھر کے اندر کیوں نہیں رہتی ہو۔

وہاں کرسچین وگ رہتے ہیں اور غریب پارسی۔

تم کون ہو؟

میں پوجا ہوں۔

پوجا؟

ہاں پوجا! ایک دن میری ماں مجھے اُس غریب گھر کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ اُس روز شہر میں گنپتی پُوجا ہو رہی تھی، یہاں ایک کوڑھی بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ اور میرا نام پوجا رکھ دیا۔ میری ماں نے گنپتی پوجائی تھی نا، جبھی ایسی سندر ناری کو اُس نے جنم دیا تھا۔ ہاہاہا۔

کون تھی تمھاری ماں۔

"اپنی ماں سے یہ پوچھو۔ کہ ماں کون ہوتی ہے۔ میری ماں کو کس نے دیکھا ہے۔" اور یہ ہے بھی سچ۔ کیونکہ پوجا کی ماں کو کس نے دیکھا ہے؟ وہ تاریکی کی چادر اوڑھے، پربھات کی

پہلی چھاؤں میں جب آکاش پر تاروں کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے یہاں ہولے ہولے قدموں سے آئی تھی۔ جب کوڑھی بھی سو رہا تھا۔ اس وقت وہ دیوی آئی تھی جس کا دل لوہے کا تھا۔ اور اسی لیے وہ لوہے کے پاس آئی تھی اور اُس نے اپنی بیٹی کو لوہے کے کٹہرے کے حوالے کر دیا۔ اور پھر اُسی پربھات کی چھاؤں میں گم ہو گئی تھی۔ کیونکہ گنپتی نے اُسے جو بیٹی دی تھی، اُس کا دھڑ نہیں تھا اور اُس کے بال جنم سے سفید تھے، پتہ نہیں یہاں وہ سونڈ لگانا کیسے بھول گئے۔"
یہ کہہ کر وہ اپنی ناک تھپتھپانے لگی۔ پھر مُسکرا کر بولی۔ "کہتے ہیں گنپتی پوجن کے روز میں کوڑھی کی کُتیا کے گرم جسم سے لگ کر اور اُس کا دودھ پی کر پڑی سوتی رہی۔ جب کوڑھی اُٹھا، جب بھی میں سو رہی تھی، اور مندروں میں گنپتی پوجن ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اور پوجا! سمجھے؟
اُس کی آنکھیں جیسے ہنس رہی ہوں۔
میں اُس روز چپکے سے چلا گیا۔ کیونکہ اُس کے بوڑھے چہرے پر وہ آنکھیں اب بھی اُسی طرح جوان تھیں۔ وہ

آنکھیں جو میری محبوب کی آنکھوں کی طرح تبسّم کناں تھیں۔ نہیں، نہیں۔ یہ وہ عورت نہیں ہو سکتی۔ وہ تو پتھر کے پُل کے اس پار رہے۔ یہ اُس پار۔ ای یا کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ دو شخصیتیں بن سکتی ہیں۔ لیکن یہاں تو پتھر کا پُل بیچ میں حائل ہے۔ نہیں، نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا، پھر یہ آنکھیں اس قدر جوان کیوں ہیں، اس قدر فہمیدہ، اس طرح ہر وقت ہنسنے والی نگاہیں.... کیوں، کیوں؟ میرے خدا۔

لیکن اُس روز کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے، وہ کوڑا کرکٹ کھا کر مغرور تھی، اور بٹّی، لعل، شیریں اور ہولی کو مٹھائی کھلا کر خوش تھی، اور اُسے آج تک کسی سے بھیک مانگتے نہ دیکھا تھا، وہ جس کا نام یوجا تھا، اور جو ایک کوڑھی کی پروردہ تھی۔ اور اس لیے ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ میں نے اُسے کبھی مغموم، کبھی اداس نہیں دیکھا۔ اس لیے جب بھی میں اُداس ہوتا تھا۔ ہمیشہ اُس کے پاس آتا تھا۔ چند منٹ سے باتیں کر کے آگے چل دیتا تھا۔

ایک دن میں نے اُس سے پوچھا۔ تم اس قدر خوش کیوں ہو۔

کیوں کا کیا مطلب؟

یعنی میں نے تو تمھیں کبھی اُداس نہیں دیکھا۔

اُس کی آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگیں، سر کے بال اور اور بھی اُوپر کی جانب کھڑے ہوتے گئے۔ جیسے اُن کی جڑوں میں برقی بٹن لگے ہوں، بولی "کھوڑھی بابا ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ اُس کی ٹانگ پر کوڑھ تھا۔ میں ہمیشہ ہنستی تھی کیونکہ میرے دھڑ نہیں ہے۔ نہ میں چل سکتی ہوں۔ نہ بچّے پیدا کر سکتی ہوں، ہا ہا، گلاب جامن کھاؤ بیٹی۔ پھر بھی دیکھو، میرے بچّے کتنے پیارے ہیں۔ ادھر آؤ۔ لعل، شیریں، ہولی بٹّی۔ بٹی۔ بیٹا! وہ اپنے ہاتھوں سے اُنہیں اُچھالنے لگی، اُس کی کشکول میں تھوڑا سا دودھ پڑا تھا۔ اور قریب ہی زمین پر ڈبل روٹی کے چند باسی ٹکڑے۔

یہ کس کے لیے، میں نے پوچھا۔ تمھارے لیے؟ آج کل تو عیش کر رہی ہو اس جنگ کے زمانے میں تو ہمیں بھی

دودھ نہیں ملتا۔

وہ بولی ۔ یہ میرے لیے نہیں ۔گُل کے لیے ہے ۔

میں نے گل کی طرف دیکھا وہ لال رنگ کے کپڑے میں سمٹی ایک تکلیف دہ لہجے میں خُرخُر کر رہی تھی۔

گل کو کیا ہوا ہے ؟ میں نے پوچھا۔

وہ مُسکرا کر کہنے لگی "جھول دیگی۔ دو ایک دن میں"

میں نے دو آنے کشکول میں ڈال دیے۔ وہ ایک آنہ مجھے واپس کرتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔تم سے ایک آنہ ہی لیتی ہوں۔ یہ لے جاؤ۔ یہ کل آنا۔گنپتی پوجن ہے ۔کل میرا جنم دن ہے ہا ہا ہا، مٹھائی کھلاؤں گی ۔ اُجلے کپڑے پہن کر آنا۔ اور حجامت بنوا کر آنا۔ .....

....

بچی، بھُرتے اور "تاؤ" کو چھوڑ کر جب میں نے غریب خانے کا رُخ کیا تو راستے میں ڈھول، تاشوں اور بیل گاڑیوں کا اک غولِ بیابانی ملا۔ عورتیں زیوروں سے لدی پھندی تھیں، بیل گاڑیاں پھلکاریوں سے سجی تھیں، بیلوں کے

سینگوں پر سنگوٹیاں چڑھی ہوئی تھیں، اور بیلوں کے جسموں کو نسوانی ہاتھوں نے رنگا رنگ نقش و نگار سے سجایا تھا۔ آج گنپتی پوجن تھا۔ اور اس لیے آج عورتوں کی آنکھوں میں کاجل گہرا تھا، لبوں پر گیت تھے، اور سینوں میں اک نامعلوم سی تھرتھری، جیسے کسی انجانے ان دیکھے۔ ان بوجھے محبوب سے گلے ملنے کی تمنا اُن کے سینوں کو ٹٹول رہی ہو۔ ڈھول کے شور میں گنپتی پوجن کا گیت ہو رہا تھا، ..... پھول گیٹ پر بندھن وارِیں ..... اور پُل کے اِس پار تیری تبسّم کناں شبنم فشاں آنکھیں جانتا ہوں تجھے میرا انتظار نہیں ہے۔ جانتا ہوں کہ تیرے سینے کے عنبر کو میری نگاہوں کے شعلے نہیں چھو سکتے، جانتا ہوں کہ تیری گردن کے خم کی ملائم برفیلی لذت سے میری انگلیوں کا لمس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناآشنا رہے گا، اور میں تنہا، بھوکا، پیاسا اس پتھر کے پُل پر سے گزر جاؤں گا۔ ایک گداگر جو دوسرے گداگر سے ملنے جا رہا ہے!

پتھر کے پُل کے اُس پار وہ بیٹھی ہے، ہنس رہی ہے،

بلّی کے بچّوں کو کھلا رہی ہے، آج گنپتی پوجن ہے، اور اُس نے ہر بچّے کے گلے میں لال نیلے پیلے اُودے رنگوں کے چیتھڑے باندھے ہیں آج بھی بلّی اُس کے سر پر بیٹھی ہے اور بلّی کی گردن میں اک خوشرنگ بُو لگی ہے۔

میں نے اُس خوشرنگ بو کی طرف اشارہ کر کے کہا "تم نے یہ فیتہ کہاں سے لیا"

وہ بولی۔ "اُس لڑکی سے لیا ہے جس کی طرف تم ہر روز گھور کر دیکھتے ہو"

جھوٹ! میں نے کہا۔

نہیں سچ کہتی ہوں، اُسی سے مانگ کر حاصل کیا ہے، عمر میں آج پہلی بار بھیک مانگی ہے۔

کیوں؟

وہ بولی۔ آج گنپتی پوجن ہے، اور مجھے اُس کی آنکھوں میں ––– وہ چپ ہو گئی۔ نجانے کیا کہتی۔ اس وقت لبوں پر اک پُر اسرار تبسم تھا

کہو۔ کہو۔

وہ ایک عرصے کے بعد بولی کچھ نہیں..... جانتے ہو۔ آج تمھیں مٹھائی نہیں کھلاؤں گی۔ گو وعدہ تھا۔

ہاں۔ پر کیوں نہیں!

گل مر گئی ہے۔ اُس نے آہستہ سے کہا " اور بچوں کو بہت بھوک لگی ہے۔

میں نے دیکھا گل ایک کونے میں لال رنگ کے کفن میں مستور غریب گھر کی دیوار سے لگی پڑی ہے۔

"اور اس کے پیٹ کے اندر جو بچے تھے؟" میں نے پوچھا۔ اور بلی سے پیار کرنے لگا۔

بس کوکھ اندھی ہوگئی۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔

بلی بڑھیا کے سر سے اُچھل کر سڑک کی طرف بھاگی۔ اُدھر سے ایک موٹر آرہی تھی۔ تیزی سے۔

ارے.....

آنِ واحد میں میں نے اُسے سڑک کے بیچوں بیچ گھٹتے دیکھا، بس ایک لمحے کی بات تھی اور پھر موٹر کا پہیہ اُس کے سر پر سے گزر گیا۔ چیخ کی سی آواز آئی، پھر بریکوں کا شور، بھاگم

بھاگ، لوگوں کا مجمع، ہجوم کے مختلف سُر..... پہلے چند لمحے تو میں گویا زمین میں گڑا رہا۔ پھر تیزی سے بھاگا۔ اور ہجوم کو چیر کر اُس تک پہنچا۔ اور اُسے پہیے سے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب تک اُسے باہر نکالا جائے وہ مر چکی تھی، اور اُس کی گردن اور اُس کے بازو اندر کی جانب مڑے ہوئے تھے، وہ آئین سٹائین کا سا سر پچک گیا تھا۔ اور بھیجا سپید ملگجے بالوں کے باہر اُبل رہا تھا۔

میں نے اُس کی گردن کو سیدھا کرنے کی کوشش کی اور اُس کے بازو الگ کیے۔ تو دیکھا کہ اُس نے اپنے سینے اور بازوؤں کے درمیان میں بلّی کو چھپا رکھا ہے، بلّی اس کے مردہ سینے سے لگی تھی، اور اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ بیچاری مرگئی یہ بھی میں نے اُسے آہستہ سے چھوا تو وہ اک دم اُچھل کر ایک طرف ہوگئی۔ اور بولی "میاؤں۔ میاؤں، اب بلّی چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ بڑھیا کا سر سونگھنے لگی، اور اُس کے سر کے گرد طواف کرنے لگی اور بے چینی سے کہنے لگی "میاؤں، میاؤں"

کار میں ریڈیو ابھی تک بند نہ ہوا تھا.... "یوکرین کی فوجوں نے دشمن کو اپنے علاقے سے باہر نکال دیا۔ اب یوکرین آزاد ہے۔ دشمنوں کے چنگل سے آزاد ہے ...."
بٹن گھما کر کار کے مالک نے ریڈیو بند کر دیا۔

لوگ سوال کر رہے تھے۔ یہ سڑک کے بیچ میں کیسے آگئی، لوگ پوچھ رہے تھے، اس بے دھڑ عورت کے پاؤں کہاں سے آ گئے تھے کس طرح وہ ایک بلّی کے بچّے کو بچانے کی خاطر عین سڑک کے بیچ میں آن پہنچی تھی، وہ جو دن بھر میں ایک گز بھی نہ چل سکتی تھی کس طرح چند لمحوں میں اس فاصلے کو طے کر کے موٹر کے پہیّوں میں آن گھسی تھی۔

عجب سوریلی منظر تھا وہ، وہ سپید مٹیالے سے بال، پُر شکن چہرہ، بے دھڑ جسم، سوکھے پستان، اور بلّی کی گردن میں رنگین فیتہ، اور بھیجا بالوں سے باہر، ایسی تصویر تو غالباً پی کا سو نے بھی نہ بنائی ہو گی، ڈالی کے ذہن میں بھی ایسا محیر العقول مرقع نہ آیا ہو گا......میں

مُسکرانے لگا۔ کیونکہ یہ رونے کا مقام نہ تھا۔
لوگ پوچھ رہے تھے۔ یہ کیسے ہوا۔ یہ کیسے ہوا،
یقیناً یہ ایک معجزہ تھا۔ ایک معجزہ۔
یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ کوئی میرے دل کے اندر باربار کہہ رہا تھا۔ ایک معجزہ تھا۔ لیکن معجزہ یہ نہیں ہے کہ پوجا نے بلّی کے بچے کو اپنی جان دے کر بچایا ہے۔ معجزہ شاید یہ ہے کہ اُس نے تمھاری بچی کو بچایا ہے۔ اس ڈاڑھی والے بزرگ کی بچّی کو بچایا ہے۔ اُس ادھیڑ عمر کے درزی کی بچّی کو بچایا ہے۔ پوجا نے شاید اُن تمام بچیوں کو بچانے کی سعی کی تھی جن کی معصومیت شب و روز اُن سے چھن رہی ہے، جن کی آنکھیں شب و روز ظالم ہاتھوں سے نکالی جاتی ہیں، جن کے سینے میں شب و روز دشمن کی گولیاں پیوست ہوتی ہیں۔
لوگ کہہ رہے تھے۔ کمبخت نے ایک بلّی کے بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔
"میاؤں، میاؤں"

کمبخت گداگر عورت .....!

میراجی چاہتا تھا کہ میں اُس وقت اُن لوگوں سے کچھ کہوں، میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں بتاؤں میں کیا کہنا چاہتا تھا اُن سے، میں اُن لوگوں سے یہ کہنا چاہتا تھا ....کہ... ہاں یہ وہی گداگر عورت ہے جسے دُنیا نے کچھ نہ دیا تھا۔ جسے اس کی ماں نے اپنی تخلیق پر شرمندہ ہو کر آہنی کٹہرے کے حوالے کر دیا تھا۔ جسے ایک کوڑھی نے پالا تھا، وہ جس کی ٹانگیں نہ تھیں، جس کا دھڑ بے کار تھا، جس کی کوکھ اندھی تھی، وہ آج مر گئی تھی۔ ایک بچّے کے لیے، ایک حسین خیال کے لیے، ایک سہانی اُمید کے لیے، اگر یہ موت ہے تو صلیب کسے کہتے ہیں۔ زندگی کسے کہتے ہیں، حیاتِ جاوداں کسے کہتے ہیں؟ کیا تم اس عورت کے چہرے کی مُسکراہٹ نہیں دیکھ سکے، اس کی آنکھوں کا روشن تبسّم نہیں پہچان سکے، جو ہر دم، ہر لمحے، ہر صدی، تاریخ کے ہر صفحے پر انسان کی محبّت کے راگ گاتا ہے۔ اور معصومیت کے اُس سرچشمے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو شب و روز انسان کے

سینے میں سو کھتا جاتا ہے۔.....

"میاؤں۔ میاؤں"

یکا یک میرے دل پر اک عجیب کپکپی سی طاری ہو گئی، مجھے محسوس ہوا، جیسے میں خود بھوکا تھا۔ ننگا تھا۔ پیاسا تھا۔ بے یارو مددگار تھا، جیسے یہ سب لوگ میری طرح بھوکے، ننگے، پیاسے تھے۔ اور اس گداگر عورت نے ہمیں کپڑے پہنائے تھے۔ ہمارے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ اور انھیں لال پیلے نیلے فیتے سجا کر ہمیں اپنے سر پر بٹھایا تھا۔ اور میں اپنے آپ سے اور اُن تمام لوگوں سے جو اک ہجوم کی صورت میں اُس بڑھیا کے گرد جمع تھے کہنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے نہیں۔ اسے دیکھتے نہیں ہو۔ آج محبّت نے موت پر فتح پائی ہے۔ آج ظلم کا جال ٹوٹ رہا ہے۔ آج آزادی کا راگ بج رہا ہے۔ یوکرین میں دشمن پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اور معصوم بچّے آگے بڑھ رہے ہیں، بلّی کے بچّے۔ آدمی کے بچّے.....

"میاؤں، میاؤں"

میں اُن سے یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ۔ لیکن میں اُس کو کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وہ لوگ اجنبی تھے۔ وہ لوگ بڑھیا کو جانتے نہ تھے۔ وہ اُسے احمق سمجھ رہے تھے، اور دیس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور تیوہار کی خوشیوں میں مگن تھے۔

اور کار کا مالک کہہ رہا تھا۔ "اس حرام زادی کو آج ہی مرنا تھا۔ اسی وقت! اب دیس میں جانے کے بجائے تھانے میں جانا پڑے گا"

اور پولیس کا سپاہی بھنگی سے کہہ رہا تھا "ارے اُس چیتھڑے کو اس کمبخت بڑھیا کے سر پر ڈال دو۔ اور اسے سڑک کے کنارے رکھ دو۔ ابھی تھوڑی دیر میں بیل گاڑی آتی ہوگی"

کول.....کول.....

ڈیوک ڈیوک.....

اسپورٹنگ ٹائمز.....

لڑکے چیخ چیخ کر اس کے پمفلٹ فروخت کرتے ہوئے ادھر آ رہے تھے۔ لوگ جلدی جلدی جیب سے نقدی نکال کر پمفلٹ خریدنے لگے۔ اب اُن کے ذہن میں گھوڑے، جاکی اور نوٹ کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔

ایک بازاری کتا دم ہلاتے ہوئے کار کے قریب آیا، پہلے اُس نے دائیں طرف کے پچھلے پہیّے کو سونگھا اور وہاں ٹانگ اُٹھا کر پیشاب کر دیا۔ پھر وہ دوسرے پہیّے کی طرف گیا۔ اور وہاں بھی اسی طرح پیشاب کیا۔ پھر وہ تیسرے پہیّے کی طرف گھوم گیا۔ اور اُسے سونگھ کر اور ٹانگ اُٹھا کر پیشاب کرنے لگا۔ پھر وہ چوتھے پہیّے کی طرف مڑا۔ اور پیشاب کر کے دُم ہلاتا ہوا چلا گیا۔ لوگ بھی پمفلٹ خرید کر جا چکے تھے۔

پولیس کا آدمی کار کے مالک کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور کار چل دی۔

سڑک کے ایک کونے میں ایک لال پیلے نیلے اودے رنگوں والا چیتھڑا اُبھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"میاؤں، میاؤں"

مندروں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"کول .... کول!"

ڈیوک .... ڈیوک

اسپورٹنگ ٹائمیز.....

یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں چٹانوں کے بیچ میں کھڑا ہوں۔ دنیا کی کوکھ اندھی ہو چکی ہے۔ اور آج گنیتی پوجن ہے!

آتا ہے یاد مجھ کو!....

پُرانے خدا

سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں میں نے اپنی عمر کے ساتویں سال میں قدم رکھا۔ اُن دنوں ہم لوگ انگبور کی وادی میں رہتے تھے، جس کا شمار اب بھی کشمیر کی حسین ترین وادیوں میں ہوتا ہے، لیکن مجھے ان دنوں اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی، اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں، ہم لوگ یہاں نئے نئے آئے تھے۔ میں اور میرا بڑا بھائی رام اور ماں جی اور پتا جی اور کامنی موسی جس کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ تھی، پھر یہاں اسکول میں — لڑکے مجھے ایک امیر آدمی کا بیٹا جان کر قابل نفرت سمجھتے تھے، اور موقع پا کر پیٹ دیا کرتے، اس کے علاوہ میں اسکول میں غالباً سب سے کند ذہن تھا،

اس لیے بھی دونوں اُستاد، مدرس اول اور مدرس دوم دونوں مجھ سے ناخوش تھے، کوئی مونس و غم خوار نہ تھا، جو سات برس کے لڑکے سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ ماں جی پتاجی کی دلداری میں مصروف رہتیں، کامنی موسی ہر وقت میرا گلا ٹٹولتی رہتیں، آج پھر تو نے کھٹے آلوچے کھائے ہیں، ٹھہر تو سہی'.... اور پھر وہ میرا گلا دبوچ کر مجھے اپنی رانوں پر لٹا کر، میرا منہ کھول کر اس میں جوشاندہ ٹپکاتیں جو اس گھاٹی میں اُگے ہوئے بنفشے، سبز چرائتے سنبلو کی جڑوں اور نہ جانے کس بلا بتر سے تیار کیا گیا تھا، اوہ۔ کس قدر تلخ، کھٹا اور بد ذائقہ ہوتا تھا وہ جوشاندہ..... اور جب کامنی موسی میری ناک پکڑ کر مجھے زمین پر گرا دیتیں یا اپنی گود میں دھکیل دیتیں اور میں غلو غلو غلو کرتے ہوئے جوشاندے کو حلق سے نیچے نہ اُتارنے کی کوشش کرتا، اور اسی ناکام کوشش میں موسی کامنی کے انگوٹھے کو چبانے میں کامیاب ہو جاتا تو جوشاندہ پی لینے کے باوجود پیٹا جاتا۔ اس دنیا میں انصاف کہاں ہے، کوئی ایک غریب سات برس کے بچے کی نہیں سنتا......!

انہی باتوں سے چڑ کر ایک دن میں نے سوچا کہ میں اب اسکول نہ جاؤں گا، بلا سے جو ہوگا دیکھا جائے گا، آخر ایسا بھی کیا، ہمارا بھی اس دُنیا میں رہنے کا اور اپنی سی کر گزرنے کا حق ہے، چنانچہ میں نے یہ سوچ کر جلدی سے سلیٹ، کاپی اور کتاب کو جزدان میں بند کیا، اور تختی بغل میں داب کر اسکول کی راہ لی، تھوڑی دُور چل کر جب گھر ٹینگیوں کے جھنڈ میں اوجھل ہوگیا، تو میں نے اسکول کا راستہ چھوڑ دوسری پگ ڈنڈی پر چلنا شروع کیا جو گھاٹی سے نیچے اُتر کر ندی کے کنارے کنارے دھان کے کھیتوں تک جاتی تھی، جہاں پن چکیاں تھیں، چشمے تھے، سبزہ تھا، جہاں دن بھر چرواہے اور چرواہیاں ریوڑ چراتے تھے۔

اسکول سے اور گھر سے بھاگنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس لیے کچھ خوش خوش، کچھ سہما سہما، کچھ آزاد سا، کچھ اُداس سا چلا جارہا تھا، اپنی دہن میں اور سوچ رہا تھا کہ اس بستے کو کہاں رکھوں، اسے لیے لیے پھرنا تو بڑی حماقت ہوگی، کوئی دیکھ لیگا تو پکڑ کر سیدھا اسکول لے جائے گا یا گھر، اب کیا ہو، اس بستے کو کہاں چھپاؤں، جب گھاٹی کے زیریں حصّے کی طرف پہنچ گیا تو میں نے

اپنے بستے کو اور تختی کو داخ کے ایک بڑے جھاڑ میں چپکے سے رکھ دیا۔ یہاں لانبی لانبی گھاس اُگی ہوئی تھی، اور زمین پر جو بیلیں پھیلی ہوئی تھیں، اُن پر نیلے نیلے اور ہلکے قرمزی رنگ کے پھُول آئے تھے جو چوڑے چوڑے پتّوں کے درمیاں گراموفون کے اُس بھونپو کی طرح نظر آتے تھے کہ جس کے سامنے سفید رنگ کا ایک کتا بیٹھا ہوتا ہے..... یکایک مجھے ایک خوبصورت گلہری نظر آئی، اور میں اُسے پکڑنے کی کوشش میں داخ کی بیل پر جو منّو کے پیڑ پر بل کھاتی چلی گئی تھی اُوپر چڑھتا چلا گیا، پھر گلہری مجھے جکمہ دے کر کہیں اُن چوڑے چوڑے پتوں میں گم ہوگئی۔ اور میں داخ کے اُن خوشوں کو ٹٹولنے لگا، جن کے دانے ابھی زمرد کی طرح سبز تھے، اور اتنے ہی سخت، داخ کے ایک دو دانے میں نے توڑ کر کھائے، بڑے پھیکے اور کڑوے تھے، اور بیج جو زبان پر آکر ٹوٹ گیا تو کونین کی گولی کی طرح تلخ معلوم ہوا، تلخ اور گلے کو گھونٹتا ہوا، میں نا امید ہو کر بیل سے نیچے اُتر آیا۔ قمیص ایک کہنی کے قریب پھٹ گئی تھی، اور پاجامہ بھی گھٹنوں کی رگڑ سے دو بڑے بڑے بھورے داغ لیے تھا، خیر، نیچے اُتر آیا،

جمائی لی، اُف کس قدر اُداس ہے یہ دنیا۔ اُن دنوں میں شاعر نہ تھا، افسانہ نویس نہ تھا، پڑھا لکھا نہ تھا، ان دنوں نہ شفق میں خوبصورتی تھی، نہ ہوا میں لطافت، نہ گھاس میں سوندھی سی خوشبو، پھول پھول تھے توڑنے کے لیے، گلہریاں پکڑنے کے لیے، تیتریاں پیچھے بھاگنے کے لیے، عورتیں جوشاندہ پلانے اور ناک مروڑنے کے لیے، اور انگوٹھا چبانے کے لیے، مرد پیٹنے کے لیے اور کان پکڑ کر اسکول بھجانے کے لیے مامور کیے گئے تھے، اس لیے میں نے زور سے اک جمائی لی اور سوچا کہ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اب نہ گھر جا سکتا ہوں۔ نہ اسکول۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں ان پہاڑوں سے پرے کہیں دُور چلا جاؤں، جہاں اچھے لوگ بستے ہیں، جہاں شہزادے اور شہزادیاں رہتے ہیں۔ جہاں جادوگر محل بناتے ہیں، اور پریزادے ہنس کے پروں پر نیلی جھیلیں پار کرتے ہیں، ہاں۔ بس یہ ٹھیک ہے!

یہ سوچ کر میں داخ کے جھُنڈ سے نکلا۔ اور گھاٹی کی ڈھلوان کی طرف بڑھا، گراموفون کے بھونپوؤں کو اپنے پاؤں سے کچلتا گیا، جُوتا اُتار کر میں نے اپنے بستے کے قریب

رکھ دیا۔ کیونکہ اب نرم نرم گھاس پر ننگے پاؤں چلنے میں لطف حاصل ہو رہا تھا۔ میں نے زور زور سے سیٹی بجانا شروع کی، کامنی موسی مجھے اس وقت سیٹی بجاتے دیکھ پاتیں تو کیا کہتیں... میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کامنی موسی کہیں نظر نہ آئیں ..... اوہ مجھے کیا پرواہے ..... میں نے اطمینان سے پھر سیٹی بجانا شروع کی۔ یکایک قریب سے کسی نے مجھے زور سے ڈانٹا اور میں خوف سے اُچھل کر بھاگا۔ پھر مڑکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کامنی موسی نہ تھیں ایک شریر ماہی مار تھا جو اب ہوا میں چیختا ہوا، شوخی سے پر کھولتا ہوا۔ پر بند کر کے ہوا میں ڈبکیاں لیتا ہوا۔ اُڑا چلا جا رہا تھا۔ کمبخت نے مجھے یوں ہی ڈرا دیا تھا۔ میں نے زمین سے کنکر اُٹھا کر اُسے مارنا شروع کیا، لیکن ایک کنکر بھی اُسے نہ لگا اور وہ قہقہے لگاتا ہوا، مزے سے اُڑتا ہوا ندی کی طرف چلا گیا، جانے دو بچہ جی کو جب ہم جادوگر سے جادو کی چھڑی چھین کر لائیں گے، پھر اس شیطان ماہی مار سے پوچھیں گے کہ اس طرح چلنے والے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر چیخنے کا کیا مطلب ہے؟

LIBRARY

ڈھلوان کے آخر میں، گھاٹی کے دامن میں دو چشمے بہ رہے تھے، یہاں گاؤں کی لڑکیوں کا اکثر جمگھٹا رہتا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہاں کسی نے مجھے گھومتے ہوئے دیکھ لیا تو رپورٹ ہو جائیگی، اس لیے میں نیچے کی طرف جاتا جاتا رُک گیا، اور پھر رُخ بدل کر گھاٹی کے درمیان سنبلو کی جھاڑیوں اور کاؤ کے درختوں میں اپنے آپ کو چھپاتا ہوا چلنے لگا۔ نیچے میں اُن دو چشموں کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ جہاں سے لڑکیاں گھڑے بھر بھر کر لیے جا رہی تھیں، لیکن میرا راستہ اُن کے راستے سے الگ تھا، اور دونوں راستے گویا ایک دوسرے کے متوازی چل رہے تھے، جی میں آیا کہ دو چار پتھر اُٹھا کر دے ماروں اور گھڑے پھوڑ دوں۔ تڑاخ سے گھڑے پھوٹ جائیں گے، اور بھاک سے سارا پانی لڑکیوں کے کپڑوں کو شرابور کرتا ہوا نیچے گر جائے گا، پھر سوچا اگر کسی نے مجھے پکڑ لیا تو ـــ اور مجھے ابھی دُور ـــ بہت دُور پریوں کے دیس جانا ہے، کہ جس کی کہانی مجھے اکثر رات کو کامنی موسی سنایا کرتی ہیں، اور جو اُن کے کہنے کے مطابق اس سلسلہ ہائے

کوہ کے پرے واقع ہے۔ میں سوچ کر رُک گیا، جھاڑیوں میں دو گُلا میں خوشی سے چنچیں اور پُھر سے اُڑ گئیں، ایک اور گلہری نظر آئی جو کاؤ کے ایک پتلے سے ٹھنڈ سے لگی مجھے مقابلے کی دعوت دے رہی تھی، لیکن اب تو میرے پائجامے کے پائینچے بھی اوس سے گیلے اور کانٹوں سے تار تار ہو چکے تھے، اس لیے میں نے آگے بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ بالکل سامنے ایک خوبصورت چکور، موٹا موٹا چتکبرا چکور، مزے سے ٹہلتا ہوا جا رہا ہے، عین سامنے، بالکل راستے میں، میں اُسے دیکھ کر رک گیا، اور ایک تنے کی اوٹ میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اسے کس طرح پکڑا جائے، پھر سارے داؤں سوچ کر میں آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ، گھٹنوں کے بل چلنے لگا تاکہ آہٹ نہ ہو ہر لمحہ مجھے اُس کے قریب لا رہا تھا۔ یکایک چکور نے گردن موڑ کر مجھے دیکھ لیا، اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُس نے اپنے پروں کو اک ہلکی سی جنبش دی اور میں نے نا اُمید ہو کر سوچا کہ اب یہ اُڑا.... لیکن میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب وہ مجھے دیکھ کر بھی بدستور اپنی چال سے چلتا رہا۔

میں نے سوچا ضرور یہ چکور جانور کسی کا پالتو ہے، اور چھوٹ گیا ہے، یا پھر یہ ابھی بچّہ ہے جو اڑ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ زخمی ہو۔ کسی لڑکے نے گوپھیا مار کر اس کا پر توڑ دیا ہو.... میں نے اپنی رفتار تیز کردی۔ اُدھر چکور نے بھی... پھر میں نے گھٹنوں کے بل پر چلنا چھوڑ دیا، اور سیدھا اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔ اور عین اُسی وقت کہ میں اُسے دبوچنے کو تھا چکور نے اپنے پر پھیلائے، اور اطمینان سے اُڑتا ہوا ہَوا میں چکّر لگانے لگا۔ اور میں گھبراہٹ میں ایک ہگواڑے کے درخت سے ٹکرا گیا اور نیلا دھاری کی جھاڑی میں جا گرا، اور وہاں سے لڑھک کر سبزے پر۔ جو پھسلا ہوں تو بیر کے ایک بڑے جھاڑ کے نیچے جا کر ہی رکا.....

یہاں پر ایک لڑکا چاقو کی مدد سے زمین کھود رہا تھا، میری ہیئت کذائی دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنی کمر پر دونوں ہاتھ ٹیک کر قہقہے لگانے لگا، میں جلدی سے کپڑے جھاڑ کر اُٹھا۔ اور گو میرے پاؤں اور بازو کانٹوں سے زخمی ہو گئے تھے بیں اس پر بھی اپنی مٹھیاں بھینچ کر اُس کی

طرف بڑھا۔ اور اُس سے پوچھا۔ "کیوں ہنستے ہو جی؟"

ہو ہو ہو!!! اُس نے ہنستے ہنستے کہا "معلوم ہوتا ہے تم اسکول سے بھاگے ہو"

"ہاں" میں نے مٹھیاں بھینچ کر جواب دیا "کیا تمہارے باپ کا اسکول ہے"

ہو! ہو! ہو!!! وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ میرے باپ کا اسکول ہوتا تو تم وہاں سے بھاگ سکتے؟ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں اور آج تک ہمارا ایک گھوڑا بھی نہیں بھاگا ...!

"میں گھوڑا نہیں ہوں" میں نے غصّے سے کہا۔

ہو! ہو! ہو!! وہ چیخا، پھر اُس نے آگے بڑھ کر اک دم مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ اور اپنے قریب کھینچ کر بولا۔ "جانتے ہو میں چاقو سے زمین کیوں کھود رہا ہوں؟

"کوئی خزانہ ہوگا" میں نے ایسی لاتعلقی کے انداز میں کہا جس میں ذرا سی دلچسپی بھی پائی جاتی تھی، اُس سے خفا ہونے کے باوجود میں اس گمشدہ خزانے میں دلچسپی لینے سے

اپنے آپ کو کیسے رُوک سکتا تھا۔

"خزانہ نہیں ہے!" اُس نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"تو پھر جادو کی تختی ہوگی" میں نے جواب دیا۔

نہیں۔ جادو کی تختی نہیں ہے۔

تو پھر کیا ہے میاں۔

خُونی بوٹی!

خونی بوٹی؟

ہاں خونی بوٹی، کبھی پیاز کھایا ہے تم نے، بس خونی بوٹی کی شکل بھی بالکل پیاز کی مانند ہوتی ہے۔ لیکن اس میں خون بھرا ہوتا ہے۔

خون؟..... کس کا خون ہے۔ کسی جن کا خون ہے اس میں.....؟

"نہیں کسی جن وِن بھُوت کا خون نہیں۔ اس میں آدمی کا خون ہے!" اُس نے جواب دیا اور میرے سارے بدن میں جھرجھری آگئی۔

"آدمی کے خون کو کیا کرتے ہیں"۔ میں نے اُس سے پوچھا۔
پیتے ہیں!
"پیتے ہیں؟" میں نے خوف زدہ ہو کر اُس سے پوچھا۔
ہاں بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ اور میرا باپ کہتا ہے، جو لڑکا اس خونی بوٹی کا خون پی لے۔ وہ ہوا میں اُڑ سکتا ہے، اُونچا.... اُڑن کھٹولے کی ضرورت نہیں رہتی۔
ارے واہ..... میں نے خوشی سے تالی بجائی، اور اُس کا چاقو لے کر کہا۔" لاؤ مجھے یہ زمین کھودنے دو"
"تم پرے ہٹ جاؤ" اُس نے مجھے غصّے سے ڈھکیل کر کہا۔" یہ بُوٹی میری ہے۔ اس کا خون میں پیوں گا"۔
نہیں میں پیوں گا .... میں نے کہا.... اور نہیں تو میں تمھیں یہ جگہ نہیں کھودنے دوں گا۔
وہ بولا۔ اچھا — تو ہم باری باری زمین کھودیں گے، جب جڑی نکل آئے گی تو اس کا آدھا خون تم پی لینا، آدھا میں پی لوں گا، اور پھر ہم دونوں ہوا میں اُڑ جائیں گے۔
میں نے خوشی سے کہا" اور ماسٹر کے سر پر پیشاب کریں گے...

اور دُور بہت دُور پریوں کے دیس میں چلیں گے ۔ کامنی ہوتی کہتی تھیں .....

وہ میری طرف غور سے دیکھ کر بولا ۔ "تو تم بنگلے میں رہتے ہو" اُس کے لہجے میں حقارت تھی ۔

میں نے شرمسار سا ہو کر کہا ۔ "ہاں" اور پھر ــــ "تم کہاں رہتے ہو؟"

وہ بولا ۔ میں اُس اُونچے پہاڑ پر رہتا ہوں ۔ ہمارا گھر مٹی کا ہے ۔ دو منزلہ ہے ۔ تمھارا بنگلہ تو صرف ایک منزل کا ہے ۔ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں ۔ میرا نام امجد ہے .....

خونی بُوٹی کی خاطر میں اُس سے لڑائی مول نہ لینی چاہتا تھا ۔ اس لیے میں نے اس شیخی خورے کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ ہو رہا ۔ امجد اور میں باری باری چاقو سے زمین کھودتے رہے ، گھونگھے ، چھوٹی چھوٹی سیپیاں ، سفید ، زرد اور سبز رنگ کے پتھر نکال کر اُن سے اپنی جیب بھرتے رہے ، آخر میں ایک لمبی جڑ کے نیچے وہ پیاز کی گٹھلی سی نظر آئی ،

اور میں نے چیخ کر کہا۔" خونی بُوٹی!"

"ہٹو۔ مجھے دیکھنے دو۔ کہاں ہے؟" امجد چلّایا اور اُس نے پھر مجھے پرے ڈھکیل دیا۔" ادھر لاؤ چاقو، تم کہیں اسے زخمی کردوگے اور سارا لہو گٹھلی سے نکل کر مٹی میں گھُل جائے گا۔ پرے ہٹو" اب وہ نہایت احتیاط سے اُس گٹھلی کے اردگرد کی زمین کو کھود رہا تھا۔

آخر وہ بھورے رنگ کی گٹھلی جس کے چاروں طرف مٹی لگی ہوئی تھی۔ صحیح و سلامت باہر نکال لی گئی، اب وہ امجد کی انگلیوں میں لٹک رہی تھی۔ اُڑن کھٹولے کی طرح .... امجد آہستہ آہستہ اُس کی جلد پر سے مٹی اُتارنے لگا۔ میں نے امجد سے کہا۔" اسے اچھی طرح تھامے رہو ورنہ یہ اُڑ جائے گی۔

تمھیں کیسے معلوم ہے؟ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

میں جانتا ہوں۔ میں نے کہا۔

امجد جب گٹھلی صاف کر چکا تو بولا۔" اب اس کا آدھا حصّہ کیسے ہوگا۔

" میں بتاؤں۔ اس کے بیچ میں چاقو سے ایک سوراخ،

اور پھر اس سوراخ کو انگوٹھے سے دبا دو۔ اور قطرہ قطرہ کر کے منہ میں ٹپکاتے جاؤ۔ میرے منہ میں اور اپنے منہ میں۔ باری باری۔ لو اب جلدی کرو۔ مجھے اُڑ کر پریوں کے دیس جانا ہے!" میں نے کہا۔

امجد نے چاقو سے گٹھلی میں شگاف کیا۔ اور وہاں انگوٹھا رکھ دیا۔ پھر اپنا منہ کھول کر اُس نے انگوٹھے کے دباؤ کو ذرا سا ڈھیلا کر دیا۔ اور آدمی کا خون اپنے منہ میں ٹپکانے لگا۔

وہ پہلا قطرہ ..... میں اُس سُرخ خونی قطرے کو دیکھنے کے لیے اس قدر بے تاب تھا۔ کہ میرا منہ بھی بے اختیار کھُل گیا۔ جیسے وہ قطرہ میرے مُنہ میں ہی ٹپکنے کو تھا۔

لیکن وہ قطرہ نہ ٹپکا۔

امجد نے انگوٹھے کو شگاف سے ذرا پرے سرکا دیا۔

اور پرے سرکایا۔

اور پرے سرکایا۔

بالکل ہٹا دیا۔

ارے!

گٹھلی سے خون کا قطرہ بھی نہ بہا۔

پھر جلدی سے گٹھلی کو چیرا گیا۔ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ لیکن خون کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پس پیاز کی مانند تہ بہ تہ چھلکے تھے۔ اُس میں اور کچھ نہ تھا۔ ذرا سا لے کر چکھا۔ کڑوا زہر تھا۔

امجد نے اُسے لے کر ذرا نیچے پھینک دیا۔ اور پھر بولا۔

"گٹھلی کچی ہے۔ ابھی اس میں خون پیدا ہی نہیں ہوا......!"

....

امجد اور میں ندی کے کنارے کنارے بہت دیر تک تیرتے رہے، اور جب تیرتے تیرتے تھک جاتے تو پانی سے نکل کر ریت پر لیٹ جاتے، اور سورج کی گرم گرم کرنوں اور ریت کی تپتی ہوئی سطح سے اپنے جسم کو گرماتے، اور کسی چوڑے پتھر پر کانوں کو ٹیک کر اُن میں سے پانی نکالنے کی کوشش کرتے۔ یہاں بہت

سے لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے ، چھوٹے چھوٹے چرواہے اور چرواہیاں جوان بڑی بڑی بھینسوں ، گایوں ، گھوڑوں اور گدھوں کے گلّوں کی اس چابک دستی سے نگہداشت کرتے تھے کہ مجھے تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح یہ دیو ہیکل جانور جو قریب ہی سبزۂ پر چر رہے تھے ان منحنی چرواہوں کے رعب میں آکر ان کے ہر اشارے کو حکم سمجھ کر بلا چون و چرا اُس کی تعمیل کرتے تھے۔

میں اور امجد ریت پر لیٹے تھے اور امجد کے قریب پارو لیٹی تھی ، اور پارو کے قریب دو تین اور لڑکے اور لڑکیاں ..... اور پارو کے بھُورے بھُورے بال سُورج کی کرنوں میں گہرے سنہری ہوگئے تھے ، اور پارو مجھے بڑی اچھی لگی تھی اور ندی میں تیرتے وقت بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تیرتے رہے تھے ، اور ایک دوسرے پر پانی اُچھالتے رہے تھے ، تیرتے تیرتے ہم دونوں پتھر کی اُن سِلوں پر اُچک کر

بیٹھ جاتے جو ندی کے بڑے بہاؤ کو ہمارے تیرنے کی جگہ سے الگ کرتی تھیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے پارو سے کہا۔

"میں ندی کے بڑے بہاؤ میں بھی تیر سکتا ہوں۔"

"جھوٹ!" وہ بولی۔

"میں ہوا میں بھی اڑ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اُڑ کر دکھاؤ" وہ بولی۔

میں نے کہا "اور میں پریوں کے دیس جا رہا ہوں آج۔ مجھے کامنی موسی نے بتایا ہے کہ ....."

پارو اپنا نچلا ہونٹ اک عجیب ادا سے سکیڑ کر بولی۔

"تو تم بنگلے میں رہتے ہو نا۔"

ہاں! اور میرے بنگلے میں پیلے گلاب کی اک بہت بڑی بیل ہے۔ تم نے پیلے گلاب دیکھے ہیں۔

"نہیں!" پارو بولی۔

اچھا۔ تو میں تمھیں بہت سے پیلے گلاب دوں گا۔ اور ایک ہار بناؤں گا تمھارے لیے۔

پارو اپنی پریشان لٹوں سے پانی نچوڑتے ہوئے

بولی۔ " اچھا تو ہم تم سے بیاہ کریں گے۔ امجد سے نہیں کریں گے۔"

امجد ؟ میں نے کہا۔" امجد تو بدھو ہے۔ وہ تو اسکول بھی نہیں جاتا....."

اتنے میں امجد تیرتا ہوا ہمارے قریب آیا۔ اور اُس نے ہم دونوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیا۔ ہم پھر تیرنے لگے۔ اور پانی کی کلیاں ایک دوسرے پر پھینکنے لگے، ہتیلیوں میں پانی بھر کر اُسے اس طرح پچکتے کہ پانی اک بلند دائرے کی صورت میں فضا میں بکھر جاتا۔ کبھی ہم دھب دھب ٹانگیں ہلا کر نقلی آبشار گراتے اور پانی کی سطح کو بلوئی ہوئی جھاگ میں تبدیل کر دیتے۔

اب ہم سب ریت پر لیٹے دھوپ کا لطف لے رہے تھے، پارو اور میں بالکل قریب لیٹے ہوتے لیکن کمبخت امجد بیچ میں آکر پارو کے قریب اوندھا پڑ گیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی ریت میں گھسی ہوئی تھی۔ کانٹے کھُردرے بالوں میں کیچڑ اور ریت تھی اور کان کی لوؤں کے

قریب ریت میں پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گڈھے بن گئے تھے، وہ نیم باز نگاہوں سے کبھی مجھے کبھی پارو کو دیکھ لیتا۔

میں نے کہا۔ "پارو اور میں بیاہ کر رہے ہیں۔

پارو کھلکھلا کر ہنسی۔

امجد نے غصّے سے پارو کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف۔

میں نے کہا۔ "اور پارو میرے ساتھ پریوں کے دیس جا رہی ہے!

امجد کی نگاہوں میں گویا خونی بوٹی کا لہو اُچھلنے لگا۔ اُس نے قہر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اُس نے اپنی اُنگلیاں ریت میں گاڑ دیں اور اپنی مٹھیوں میں ریت بھینچ کر بولا۔ "یہ سچ ہے پارو؟"

پارو نے اپنی سنہری لٹ جو اُس کے رخسار پر لرزاں تھی اپنے دانتوں کے درمیان رکھ لی اور چپ چاپ ہنسنے لگی۔

امجد نے اپنی ریت سے بھری ہوئی مٹھیاں اُوپر اٹھائیں۔

اور وہ اُسی ریت کو میری آنکھوں میں جھونکنے کو تھا کہ ندی کنارے کسی نے آواز دی۔ "ہو جر یو رُوٹی کھا لینوا!"

یکایک بھوک سب پر غالب آگئی۔ امجد کی مٹھیاں ریت سے خالی ہوگئیں۔ اور ہم سب لوگ ندی کے کنارے تنو کے درخت کے نیچے چلے آئے۔ مکئی کی روٹی تھی اور گنبھار کا ساگ، ہر گھر سے گنبھار کا سالن آیا تھا۔ دو ایک گھروں سے یہ سالن بھی نہ آیا تھا۔ صرف مکئی کی روٹی تھی اور پسی ہوئی سُرخ مرچ اور نمک، پارو کے گھر سے پیاز کی تین گٹھلیاں بھی آئی تھیں۔ اور پارو نے اُنھیں جلدی سے پتھر کی ایک بڑی سی سل پر رکھ کر پیس ڈالا اور نمک، مرچ اور وہیں سے جنگلی پودینہ توڑ کر چٹنی بنا ڈالی، سب سے پہلے اُس نے مکئی کی روٹی پر چٹنی رکھ کر مجھے کھانے کو دی۔ پھر امجد کو۔ بعد میں خود۔ امجد اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ مجھے روٹی کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ پارو کے کندنی چہرے پر اُس وقت اک عجیب معصوم، شریر، شوخ اور بھولی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ چہرہ، وہ مسکراہٹ مجھے

اب بھی یاد ہے ......

کھانے کے بعد ہم لوگ ندی سے پانی پی رہے تھے کہ امجد نے مجھے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا۔ پارو چیخی، میں نے غصے میں آکر امجد پر پانی پھینکا اور پھر ندی سے نکل کر اُس سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔

امجد بولا۔ "بس اپنے بنگلے کو چلے جاؤ۔ سیدھے۔ پارو سے میں بیاہ کر رہا ہوں"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ پارو سے میں بیاہ کروں گا۔ تُو تو مسلمان ہے۔ پارو سے بیاہ کیسے کریگا"

وہ بولا۔ "اس میں کیا ہے۔ اور تم تو باہر کے رہنے والے ہو۔ تم پنجابی ہو۔ ہم کشمیری ہیں۔ اور پھر تمھارا باپ بنگلے میں رہتا ہے"

بنگلے کا ذکر سُن کر سارے چرواہے ہنسنے لگے۔

"اور پھر تو اسکول جاتا ہے ہر روز — اسکول!"

پھر امجد دوسرے چرواہے اور چرواہیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ دیکھا تم نے — یہ لڑکا روز اسکول جاتا ہے!"

اسکول پر پھر اک بلند قہقہہ گونجا۔ اور میں نے تاؤ میں آکر امجد کو ایک گھونسا لگا دیا۔ امجد نے مجھے .... جلد ہی ہم ایک دوسرے پر پل پڑے۔ گتھم گتھا ہوگئے۔ اور لڑکے لڑکیوں نے ہمیں ایک حلقے میں لے لیا۔ اور شور مچا مچا کر داد دینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا دم پھولنے لگا۔ اور امجد نے مجھے زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ اڑی گھوڑا دے کر۔ اور میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اب میں بازی ہار چکا تھا۔ اور ریت میری آنکھوں میں تھی، اور کانوں میں اور حلق میں، پھر بھی جب تک میں نے اچھی طرح دانت کٹکٹا کر اُس کے بازو کو نہ کاٹ کھایا امجد نے مجھے چھوڑا نہیں۔

ایک لڑکے نے کہا "یہ غلط بات ہے۔ اس نے امجد کی بازو کو کاٹ کھایا ہے۔"

دوسرا بولا "ہاں یہ کشتی کے داؤ میں داخل نہیں۔"

تیسرا بولا "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

ایک لڑکی بولی۔ "اسے سزا ملنی چاہیے۔ یہ ٹھیک نہیں لڑا ....."

پارو بولی۔ "ہاں اس لڑکے کے کپڑے یہاں رکھ لو۔ اس نے امجد کی بازو کاٹ کھائی ہے۔ یہ لڑکا ہے یا باؤلا کتا!"

پھر سب چرواہے "باؤلا کتا۔ باؤلا کتا" کہہ کر مجھے چڑانے لگے، میری آنکھیں جو پہلے ہی ریت سے جل رہی تھیں، اب غم و غصّے سے بھر آئیں۔ اور میں دہاڑیں مار مار کر روتا ہوا ننگ دھڑنگ اپنے بنگلے کو روانہ ہوا۔ اور دُور تک چرواہے اور چرواہیاں ناچ ناچ کر اور چیخ چیخ کر مجھ پر آوازے کستے رہے۔ "بنگلے کا باؤلا کتا۔ بنگلے کا باؤلا کتا"....

کپڑے کھوئے۔ جوتا کھویا۔ جزدان کھویا۔ اور ہر جگہ اچھی ٹھکائی ہوئی۔ ندی پر..... گھر پر..... اسکول پر..... لیکن مجھے کسی پر غصّہ نہ تھا۔ نہ امجد پر.... نہ گھر والوں پر.... نہ مدرس پر..... مجھے صرف پارو پر غصّہ آتا تھا اور رہ رہ کر آتا تھا.... کم ذات کمینی.... کہتی تھی اس کے کپڑے چھین لو.... ہائے ہائے نہ ہوئی اُس وقت میرے

پاس جادوگر کی چھڑی ورنہ کمبخت کو ایک پل میں چھپیا بنا دیتا.....!

پارو میرے جذبۂ محبت کی پہلی شکست تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس وقت میں اس وجہ سے، اس شکست، اس رنج، ان آنسوؤں کو نہ پہچان سکا تھا۔ لیکن..... شکستوں کے اس لمبے جلوس پر جب کبھی میں مُڑکر نظر دوڑاتا ہوں۔ تو حدِ نگاہ پر مجھے پارو کا کندنی چہرہ نظر آتا ہے، اُس کی بھولی بھولی آنکھوں میں معصوم شرارت ہے، اور اپنے دانتوں میں اُس نے ایک سنہری لٹ داب رکھی ہے اور خاموشی سے ہنس رہی ہے....!

دوسرے دن شاید کوئی تیوہار تھا۔ اور میں نئے کپڑے پہنے بنگلے کے باہر زرد گلاب کی بیل کے نیچے کھڑا تھا، اور اس امید میں تھا کہ کب ماں کیمرہ لے کر باہر آئیں اور میرا فوٹو اُتریے، اتنے میں امجد ہاتھ میں گوپھیا لیے دوڑتا ہوا وہاں سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کہنے لگا۔ "یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

میں نے مُنہ پھیر لیا۔
اُس نے گلاب کے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی رنگا رنگ تیتریوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "آہا ہا ہا، تمھارے ہاں تو بڑی اچھی تیتریاں ہیں۔ تم انہیں پکڑتے نہیں ...."
اُس کے لہجے میں بڑی ملائمت تھی۔ جیسے وہ مجھ سے معافی طلب کر رہا ہو۔ میرا دل بھی تھوڑا سا پسیجا۔ لیکن میں چپ ہو رہا۔ اُس نے اپنے گوپھیے میں ایک کنکر رکھ کر زور سے چلایا۔ اور بولا "لو —— یہ کنکر وہاں پارو کے گھر تک چلا گیا ہے۔ آج پارو نے نئے کپڑے پہنے ہیں۔
میں چُپ ہو رہا۔
"ہم مندر میں بیاہ کرنے جا رہے ہیں" وہ بولا۔
میں جواب دینے کو تھا۔ کہ سامنے سے مجھے پارو آتی دکھائی دی، وہ اُجلے کپڑے پہنے اپنے باپ کی اُنگلی سے لگی چلی آ رہی تھی، اور اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ جس کے سر پر ایک نہایت خوبصورت سبز رنگ کے ستاروں والی مخملی ٹوپی تھی۔ اور پاؤں میں چرَ چرَ

کرتا ہوا بنیا جوتا تھا۔

یہ اس کے چاچا کا لڑکا ہے۔ امجد نے خود ہی مجھے بتایا۔

پارو نے ہم دونوں کو پیلے گلاب کی بیل کے نیچے کھڑے دیکھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک نگاہ بھر کے دیکھا۔ اور پھر اک مغرور ادا سے منہ پھیر لیا اور اپنے چچا زاد بھائی سے ہنس ہنس کر بات کرنے لگی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں میں باہیں ڈالے پارو کے باپ کے آگے ناچتے ہوئے دوڑنے لگے۔ پارو کا باپ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

امجد کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے نہایت احتیاط سے گوپھیے میں ایک کنکر رکھا۔ اور اُسے ایک زناٹے کے ساتھ پارو اور اُس کے ساتھی لڑکے کی طرف پھینکا۔ پارو نے مڑ کر ہماری طرف شریر نگاہوں سے دیکھا اور پھر مسکرا کر اُس نے بالوں کی ایک لٹ اپنے دانتوں میں داب لی اور پھر ناچتے دوڑتی آگے چلی گئی.....!

امجد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"بڑی کمینی ہے پارو!"

"کم ذات ہے!" میں نے کہا۔

اور اس کا باپ تو دیکھو۔ وہ بولا۔ "گنجا، سڑے چمڑے کی طرح....

میں نے کہا۔ "اس کی ناک دیکھی؟ کریلے کی طرح!...

امجد بولا۔ "اور اُس لڑکے کا مُنہ کیسا تھا؟ جیسے پھٹا ہوا ڈھول!

اور وہ چلتا کس طرح تھا۔ میں نے اُس کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔ "باگڑ بلّے کی طرح!

ارے وہ تیتری۔ آہاہاہا! امجد چلّایا۔

اور پھر ہم دونوں باڑھ پھاندکر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُس یاقوتی تیتری کی طرف لپکے جو باغیچے میں ناچتی ہوئی جارہی تھی۔

ہماری مطبوعات

بچوں کے خطوط اول و دوم ۔ مولوی عبدالحق صاحب ۔ قیمت عہ

انتقادیات اول، دوم ۔ تنقیدی مضامین جناب نیاز صاحب فتح پوری لعہ

مضامین فرحت اول، دوم، ہفتم ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب ۱۲/ ۸/ ۱۲/

مشاہیر کی بیویاں ۔ (مشرق) مبارز الدین صاحب ایم ۔ اے ۱۰/

مشاہیر چین ۔ میر عابد علی صاحب بی ۔ اے ... قیمت ۸/

نوک جھونک ۔ کوثر چاند پوری ... قیمت ۱۲/

مسکراتے آنسو ۔ بھارت چند کھنہ ۔ .... قیمت ۱۲/

لینن گراڈ تا سمرقند (عشرت صدیقی) چند گھنٹے مزدور کی دنیا میں بسر کیجئے اور غور کیجئے کہ مزدور نے اپنے لیے جو دنیا تعمیر کی ہے وہ ہماری دنیا سے کس حد تک بہتر ہے یہ دلچسپ سفرنامہ آپکو ایک انوکھی سرزمین کا سیر کرائیگا ۔ ۸/

نئے پرانے ۔ سہیل عظیم آبادی .... قیمت ۱۲/

عہد حاضر کے بڑے لوگ ۔ محمد مرزا دہلوی " للعہ

افسانچے ۔ برج موہن دتاتریہ کیفی .... " ۱۲/

نقش امروز دکن کے فاضل صحیفہ نگار، جوان سال ادیب، ممتاز ترقی پسند شاعر جناب علی اشرف صاحب (معتمد انجمن جرائد) کا پہلا مجموعہ کلام جو اپنی معنوی لطافتوں اور زندگی افروز حقیقتوں کی بدولت شعر و ادب کی دنیا میں نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ .... قیمت عہ

۱۹۴۵ء کی زیرِ طبع بہترین کتابیں

۱- مقالات عبدالحق - مولوی عبدالحق صاحب ... زیرِ طبع

۲- نئی بیماری - مہندرناتھ صاحب ... ״

۳- یادِ ایام - عبدالرزاق صاحب کانپوری ... ״

۴ کلیاتِ فانی - فانی صاحب بدایونی ... ״

۵ روزنامچہ - قاضی عبدالغفار صاحب ... ״

۶ قرآنی مملکت - شاہد حسین رزاقی صاحب ... ״

۷ پولیٹیکل ڈکشنری - عبدالقدوس ہاشمی صاحب ... ״

۸ تقاریر بہادر یار جنگ - دارالاشاعت سیاسیہ ״

۹ سوانح حیات بہادر یار جنگ ״ ״ ״ ״

ملنے کا پتہ - کتاب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) عابد روڈ - حیدرآباد دکن